غالب اور بنارس

مرتبہ

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

غالب اور بنارس

غالب اور بنارس

مرتبہ

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ

Ghalib aur Banaras
BY :
Shahid Mahuli

I.S.B.N. 81-8172-0407

اہتمام	:	شاہد ماہلی
اشاعت	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۱۵۰/روپے
مطبوعہ	:	اصیلا پرنٹنگ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲
www.ghalibinstitute.com-- email: ghalib@vsnl.net

فہرست

پیش لفظ

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ہر سال کئی اہم قومی اور بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے۔جس میں ملک اور بیرونِ ملک کے بڑے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے اُن مقامات پر بھی سمینار منعقد کیے ہیں جن مقامات پر غالب کا قیام عمل میں آیا ہے۔ رام پور، الٰہ آباد کلکتہ، بنارس اور آگرہ وہ خاص شہر ہیں جہاں غالب نے اپنی زندگی کے اہم دن گزارے اور ان شہروں کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ میں غالب کا نام اور غالب کے علمی اور ادبی کارناموں کا ذکر محفوظ ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اِن شہروں میں جاکر سمینار کیا اور اُن شہروں سے وابستہ غالب کی یادوں کو سمیٹ کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آگرہ اور رام پور سے متعلق مقالات کتابی شکل میں قارئین تک پہنچ چکے ہیں۔ 'غالب اور بنارس' کے عنوان سے یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اہلِ علم اِس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بنارس میں چند دنوں کے قیام نے غالب کی زندگی پر کتنے خوش گوار اثرات مرتب کیے، غالب نے بنارس وہاں کی آب و ہوا، وہاں کے لوگ، وہاں کی مشترکہ تہذیب اور وہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی بے پناہ تعریف کی ہے۔ خصوصاً اُن کی مشہور فارسی مثنوی 'چراغِ دیر' کا شمار ہندستان کے فارسی ادب کے اعلا شہ پاروں میں ہوتا ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے سے اس

بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بنارس شہر کو شاید ہی کسی اور نے غالب سے بہتر خراجِ عقیدت پیش کیا ہو۔

اس کتاب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر اسلم پرویز اور دوسرے کئی اہم نقادوں اور محققوں کے نہایت ہی علمی مقالے موجود ہیں۔ ان علماء نے اپنی تحریروں کے ذریعے غالب اور بنارس کے حوالے سے تحقیق وتنقید کے نایاب گوشوں پر بحث کی ہے۔ اس موقع پر ہم شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ کے بھی شکر گذار ہیں جنہوں نے اس ادبی مذاکرے کے انعقاد میں ہمیں بھرپور تعاون دیا۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب غالب شناسی میں ایک اہم اضافے کی حیثیت سے علمی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

شاہد ماہلی

صدیق الرحمٰن قدوائی

غالب کا سفر اور ان کی تخلیقی زندگی

غالب کا ایک شعر ہے:

مری تعمیر میں مُضمر ہے ،اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

یہ شعر پورے انسانی وجود کا اشاریہ ہے۔ تفصیل میں جایئے تو فلسفیانہ موشگافیوں کے گورکھ دھندے میں پھنستے چلے جائیں گے لیکن جس شاعرانہ حسن کے ساتھ زندگی کے تجربات کے بارے میں غالب نے اپنے احساس کی شدت کا اظہار کیا ہے۔ تعمیر اور خرابی کو برقِ خرمن اور دہقاں کے خون گرم کے استعارے کے ذریعے تاثرات کی ایک وسیع دنیا سامنے آجاتی ہے اور وہیں کہیں ہمیں وہ غالب ملتے ہیں جن کے اردو فارسی خطوط میں خارجی دنیا سے ان کے رشتے اور ان میں کئی مقامات پر ان کی انا کے ساتھ تصادم نظر آتا ہے۔

کسی شاعر کی زندگی کے اصل واقعات اور اس کے تخلیقی مزاج کے درمیان رشتہ تلاش کرنا کس حد تک مناسب ہے اور اس کی تخلیقات کو سمجھنے میں کہاں تک کارآمد ہوسکتا ہے۔ یہ ایک مستقل سوال ہے جس کا کوئی سیدھا جواب شاید ممکن نہیں۔ اس کا ایک عام سبب تو یہی ہوسکتا ہے کہ شاعروں کی اصل زندگی اور ان کی اُس شاعرانہ شخصیت میں جو ان کی

تخلیقات میں نظر آتی ہے اکثر تضاد ہوتا ہے۔ فرائڈ کے مطابق تو زندگی کی ناآسودگیوں کو ہی دراصل اپنے اظہار کی راہ اس کے فن میں مل جاتی ہے۔ گویا اس طرح وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔ بہرحال یہ بحث بڑی طویل ہوسکتی ہے مگر سب باتوں کے باوجود کسی جواب سے پورے طور پر تشفی اس لئے نہیں ہوتی کہ اگر کسی شاعر کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں بیشتر حقائق سامنے آجائیں تو ان کے اور ان کی تخلیقات کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے، خواں وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو اور پھر زندگی کے بہت سے واقعات وحادثات ایسے ہوتے ہیں جنہیں خود شاعر شعوری طور سے فنی روپ دیتا ہے ایسے فن پاروں کا داخلی تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت کچھ ایسا بھی مل سکتا ہے جس کا خاموش محرک وہ واقعہ ضرور تھا، مگر جو اس واقعے سے الگ ہو کر بھی پڑھنے والوں کے ذہن کو دوسری سمتوں میں لے جاتا ہے۔

غالب اتفاق سے ہمارے کلاسیکی شاعروں میں اکیلے شاعر ہیں جن کی زندگی اور شخصیت سے متعلق بہت کچھ معلومات آج فراہم ہو چکی ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر تو انہوں نے خود اپنے خطوط یا دوسرے بیانات کی شکل میں چھوڑی ہیں۔ چنانچہ غالب کا کلام پڑھتے وقت اکثر ذہن ان سمتوں میں سفر کرتا ہے جدھر خود غالب اشارہ کرتے ہیں۔ غالب کا وہ سفر جس کی ایک منزل بنارس تھا وہ کلکتہ پر بظاہر تو ختم ہوا مگر دراصل اس کے بعد بھی جاری رہا اور اس طویل سفر میں جو زادِراہ انہوں نے کانپور، باندہ، الہ آباد، لکھنؤ اور پھر بنارس میں حاصل کیا وہ آئندہ کے لیے محفوظ ہوتا رہا۔ اس زادِراہ میں دوسروں سے لیا ہوا قرض، لڑھیا، گھوڑا، چھکڑا، اور ''بخیل کی طبیعت جیسا مکان'' وغیرہ شامل تو ہیں دلچسپ بھی ہیں مگر وہ باہر کی دنیا کے ہیں۔ ان سب کے نتیجے میں غالب کے اندروں میں جو کچھ واقع ہو رہا تھا۔ وہ ہمارے لیے زیادہ معنی خیز ہے۔

غالب کی ناآسودگی جو اشعار میں ڈھل کر ایک تہ بہ تہ مغنیاتی نظام کو ساتھ لے کر آئی اس کا ایک سبب خارجی دنیا میں ہونے والے واقعات سے ان کی انا کا وہ تصادم تھا جس میں بار باران کا احساس مجروح ہوتا مگر جس بدولت سے اندر ہی اندر ان کے ذہن ودل کو بے چین رکھ کر ان کی تخلیقی جبلت بھی متحرک ہوتی تھی۔ پنشن کے معاملات، جیل کی اذیت

ناک اور ذلت آمیز زندگی، قرض خواہوں کے معاملات ہوں۔ کلکتہ کا معرکہ پھر فارسی دانوں کی طرف سے ان کی لیاقت پر لعن طعن۔ ذوق اور اپنے دوسرے ہم عصروں سے چشمکیں ہوں۔ ان سب میں غلطی ان کی ہو یا نہ ہو اُن کی ذاتی زندگی کے دکھوں کا سبب یہی سب باتیں نہیں۔ اس نے ان کے اندر اندر ایک حشر برپا کر رکھا تھا جو کبھی انہیں ذلت کے اس احساس پر پہنچا دیتا تھا جس میں شدید طنز بھی تھا۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

یہ کیفیت ان کے خطوط میں بار ہا آتی ہے۔ مگر پھر ان کی انا یوں بھی کارفرما تھی:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جس شخص کو اپنے حسب نسب پر اتنا فخر ہو جو غالب کو تھا اور جسے شاعرانہ کمال پر ان جیسا اعتماد ہو، اسے ہر ہر قدم پر ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز ہوتا دیکھے۔ پھر بھی اُن پر بار بار اصرار کرے اور اس کے باوجود شکست کھاتا رہے اس کی شخصیت کی اندرونی کیفیت جو آن بان کے ساتھ زندہ رہنے پر بھی مصر ہے۔ فقدانِ راحت کی شکوہ گزار رہتی ہے۔ وہ جس رئیس سے سرپرستی اور مالی مدد کی اُمید کرتا ہے اس کو نو دولتیہ قرار دے کر اس لیے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ اُن سے کھڑے ہو کر معانقہ کرنے اور نذرانہ کی رسم معاف کرنے پر تیار نہیں ہوتا ہے۔ اسے فاقہ مستی گوارا ہے لکھنؤ کو چھوڑ کر چلا جانا منظور ہے مگر وہ پیسہ قبول کرنا گوارا نہیں جس کی خاطر اُسے اپنا نسلی وقار اور شاعرانہ کمال کم تر ہوتا ہوا محسوس ہو۔ غالب کے یہ الفاظ ان کے اس مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں خارجی دنیا میں ان کی انا متصادم ہے مگر اندر اندر وہ اسے سینہ سے لگائے رکھتے ہیں

"......خدا گواہ ہے وہ قصیدہ جو میں نے آغا میر کی مدح میں لکھا ہے، میرے خاندان کے لیے باعثِ رسوائی ہے۔ اب لطف یہ ہے کہ قصیدے کے ان اشعار کو کاغذ سے مٹا نہیں سکتا۔ نواب مرشد آباد بھی سیّدزادے ہیں۔ اس قصیدے کو اُن کے نام سے

مشہور کر رہا ہوں۔ اگر چہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا لیکن ہمایوں جاہ کی مدح مجھے ناگوار نہیں ہے۔ جب تک اس قصیدے کے ممدوح سے مختص اشعار شامل نہ کرلوں۔ یہ اشعار کسی کو نہ دکھائیں اور بزرگوں کی طرح چھوٹوں کے عیب پوشیدہ رکھیں۔"

''معانقے کے سلسلے میں ملاقات کے لیے اُن (معتمد الدولہ) کی طرف سے کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ ذہنی معاملے نے عملی صورت اختیار نہیں کی۔ چوں کہ اُن معاملات کی وجہ سے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا دل زخمی تھا، نیز طویل اور دشوار مقصد در پیش تھے۔ میں نے پاسِ ناموسِ خاکساری کی وجہ سے استغنیٰ سے کام لیا تھا اور اُن نو دولتیوں کے اختلاط سے اپنا دامن بچالیا۔ اگر چہ اُس خواہش کا نقش دل پر باقی نہیں، لیکن وہ تحریر کاغذ پر محفوظ ہے۔ چناں چہ ہزیاں نگار قلم سے وہ (عرض داشت) نقل کر رہا ہوں''۔ (فارسی سے ترجمہ)

اس طرح خود کو دربار میں پا کر بھی وہ خود کو اس کے حاشیہ نشینوں سے الگ اور دوسروں سے ممتاز قرار دیتے ہیں

نوابوں اور رئیسوں سے اُن کو ہمیشہ اُمید رہتی تھی کہ ان کے اس مرتبے کے مطابق پیش آئیں جس کا شدید احساس خود ان کے مزاج میں اتنا ڈھل گیا تھا کہ اگر اس میں کہیں کوئی کسر دیکھتے تو اس سے ذلت کا احساس اور زیادہ ہوتا۔ ان کی مفلسی اس دکھ کو اور بڑھا دیتی ہوگی۔ حالات ان کو مجبور کرتے تھے۔ کہ وہ ان ہی لوگوں کے پاس جائیں۔ اُن سے قصاید کے ذریعے رابطہ بھی قائم کریں اور داد خواہی بھی۔ اپنے مرتبے کی بلندی کا احساس اور پھر دنیا کے رواج کے مطابق سرکار دربار سے لے کر کوچہ و بازار تک خود کو رسوا ہوتا محسوس کرنا معمولی حادثہ نہیں تھا۔ بار بار انہیں اپنے دل و دماغ کے اندر کی دنیا میں سمٹ کر ان کو بہت سے سوالات سے روبرو کرتا ہوگا۔ مثال کے طور پر ان کا میر ولایت علی شرف

الدولہ کولکھا ہوا یہ مکتوب دیکھیے:

بنام میر ولایت علی صاحب مخاطب بہ شرف الدولہ

خط ۔۱

خدا کی لعنت مجھ پر کہ (میں نے) شاہزادہ ماہ لقا (نصیرالدین حیدر ولی عہد شاہ اودھ) کے حضور زمین بوسی کی آرزو کی اور وہ بھی آپ کی وساطت سے مجھے بہر طور یقین ہے کہ اہل عقل کو اس کا علم ہے کہ میرے گوہر تاباں کی تابانی میں کہ جس کی چمک دمک ایک عطیہ الٰہی ہے اس تقصیر کے باعث کہ جو قدر ناشناسوں کی جانب سے ہوئی، کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن وہ ادا کہ جو طور طریقے کے مطابق نہ ہو بھلا (میری) طبیعت کو کس طرح گوارا ہو سکتی ہے۔ اس ہی دفعہ شاہزادے سے نہیں ملا ہوں بلکہ اس سے پہلے بھی دو بار اس نشیمن باسعادت میں گیا ہوں۔ اور ہر دو بار (انہوں نے مجھے) فوراً باریابی بخشی ہے اور دیر تک بٹھایا ہے اور میری عزت افزائی کی ہے لیکن اس بار شاہزادے کے رویے کو فطری نہیں کہا جا سکتا۔ یقیناً میرے آنے سے پیشتر ہی اس بات کا فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ تھوڑی دیر مجھے پاسبانوں کے ساتھ بٹھایا جائے اور جب تک کہ شہزادہ کو صندوقچے کے مشغلے میں نہ لگا لیا جائے مجھے حضور میں نہ بلایا جائے اور جب سامنے آؤں حضرت صاحب عالم اظہار التفات نہ کریں اور مجھے بیٹھنے کی اجازت نہ دیں۔ گویا کہ شاہزادہ ایک ورق سادہ ہے کہ نقاشوں اور رنگ آمیزوں کے ہاتھ میں آ پڑا ہے تا کہ رنگ رنگ کے ڈول ڈالیں اور طرح طرح کے نقش بنائیں۔ قصہ مختصر تقریب اور چیز ہے اور تخریب اور۔ ہم تو آپ سے مقرب (کا کردار) چاہتے تھے نہ کہ مخرب کا۔

ع: خود غلط بود انچه ماپنداشتیم

ترجمہ: دراصل جو ہم سمجھ رہے تھے وہی غلط تھا۔

افسوس شہزادہ کی زمین بوسی کا ارادہ کرنا اور پھر آپ مروت کی امید رکھنا۔ ہم شاہ پرستوں میں ہیں اور کشور کشاؤں کے دست تیغ آزما ہی سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔ (بھلا) زاویہ نشینوں سے ہمارا کیا تعلق اور رشتہ شکستگاں سے کیا علاقہ۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں اس تحریر کے ذریعے آپ سے تلافی کا خواہشمند ہوں۔ (نہیں) میرا مقصد تو آپ

کوصرف یہ بتانا ہے کہ آپ یہ نہ جانیں کہ میں نہیں جانتا۔ والسلام

غالب نے اپنے سفر کے دوران جہاں جہاں قیام کیا اس وقت کے ہندوستان کے اہم ترین شہر تھے۔ کلکتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام ہی نہیں تھا وہ یورپ کی اُن ساری نو آبادیوں میں جو امریکہ سے لے کر ایشیا اور افریقہ تک پھیلی ہوئی تھیں سب سے پر کشش ساحلی شہر تھا۔ ہندوستان کی ہی نہیں سارے جنوب ایشیا کے دولت پر یہاں سے قابو رکھا جاتا۔ یہاں عیش وعشرت کا جو بازار گرم تھا اس کی بنا پر یورپ کے زیادہ تر مہم باز نو جوانوں کی نظر میں یہی منزل آخر تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی زندگی اُن سب کے لیے قابل رشک تھی۔ یہاں وہ عموماً خالی ہاتھ آتے تھے اور لندن واپس جانے کے بعد وہاں کی سیاسی ومعاشی زندگی میں کلیدی حیثیت اختیار کر چکے ہوتے تھے۔ کلایو اور ہسٹنگز کے بارے میں تو جو حقائق سامنے آئے وہ سب جانتے ہیں۔ نو جوان عیسائی انگریزوں کی عام بے راہ روی کے پیش نظر وہاں مسیحی مبلغوں نے بھی آنا شروع کیا کہ وہ نو واردوں کی نگرانی اور اصلاح کریں۔ فورٹ ولیم کالج بھی دراصل اس خاص مقصد سے قائم کیا گیا تھا کہ انگریز نو جوانوں کو ناپختہ عمر میں ایک سخت ڈسپلن میں بھی رکھا جائے تاکہ وہ فرانس کے لوگوں کی شہنشاہیت مخالف جمہوری خیالات سے بھی متاثر نہ ہو جائیں۔ غالب نے جب مشرقی ہندوستان کے برباد، افلاس زدہ علاقوں سے گزرتے ہوئے زوال کے شکار رئیسوں کے درباروں کو دیکھا ہوگا اور پھر جب کلکتے پہنچے ہوں گے اور وہاں کے قیام کے دوران میں انہیں اچنبھے میں ڈال دینے والے مناظر نظر آئے ہوں گے تو آئین اکبری کی تقریظ اور

'ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے'

والی غزل سے کہیں زیادہ اشارات ان کے ذہن ونظر کو متوجہ کرنے کے لیے ملے ہوں گے۔ ان کے کلام میں تشکیک، استفہام، بے یقینی،

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔

—

حیراں ہوں پر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جیسے سوالات کہیں اندر اندر پروان چڑھ رہے ہوں گے۔ جو اُن کی شاعری کا

بہترین حصہ قرار پائے۔

غالب کا بنارس میں قیام ان کے اس سفر کے دوسرے مقامات کے قیام سے اس اعتبار سے زیادہ اہم ہے کہ اور مقامات پر تو انہیں وہ ساری باتیں ملی ہوں گی جو اجنبی بستیوں اور راستوں میں عموماً ملتی ہیں اور ہر نئے مسافر کو حیرت میں ڈالتی ہے مگر بنارس دہلی کی طرح اس ملک کا ایک تاریخی شہر ہونے کے باوجود اس پوری تہذیبی روایت سے بہت کچھ مختلف بھی تھا جس کے درمیان غالب دہلی اور آگرہ میں پلے تھے۔ خصوصاً اس علاقے کے اشرافیہ کا اپنا ایک الگ طرزِ زندگی تھا۔ بنارس ہندوستان کی قدیم ویدک تہذیب اور ہندو عقاید کے مطابق ایک مقدس ترین شہر تھا۔ یہاں اس ملک کے قدیم علوم کے مراکز تھے۔ گنگا کا گھاٹ دہلی میں جمنا کے گھاٹ سے ہی نہیں ساری دنیا کے دیاروں کے ساحل سے کتنا مختلف ہوگا۔ اور وہ صرف گھاٹ نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے ہزاروں سال کی جیتی جاگتی تہذیب ہوگی۔ اس کا اندازہ بنارس آئے بغیر کیسے ہوسکتا تھا۔ پھر دہلی کی طرح یہاں بھی ایک طرح کی ہموار تہذیبی زندگی بھی تھی جو تاریخ کے تمام نشیب وفراز سے گزرنے کے باوجود ہر بار پھر اپنی وضع پر واپس آجاتی تھی۔ چنانچہ غالب کے لیے حیرتوں کا ایک نیا سماں تھا جو بنارس میں اُنہیں ملا۔ جیسا کہ اُن کی اس دور کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ شہر کے حُسن، اس کے حسینوں کی ادائیں، گنگا کے گھاٹ کے مناظر اور ان سب سے زیادہ وہاں کے عالموں، سادھوؤں اور سنتوں کی گفتگو کی گہرائی، غرض کہ ایک ایسی زندگی ملی جس سے وہ آشنا تو تھے کہ ہندوستان میں کون اس سے نا آشنا ہوگا مگر جس کے درمیان رہ کر اس سے اس قدر ہم کنار ہوئے کہ اُن کی شاعری میں ''ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں'' یا ''نہیں کچھ سبحہ وزنار کے پھندے میں گیرائی'' جیسی باتیں آگئیں چنانچہ ان کے ہاں تصوف اور ویدانت کے اثرات محض روایتی اور ''برائے شعر گفتن'' ہی نہیں آئے ہوں گے۔

ان سب باتوں پر اور غالب کی زندگی کے اس اہم دور پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری کی خوبصورتی اور ان کے افکار پر بہت سے اثرات کو اس وقت تک نہ پورے طور پر سمجھا جا سکتا ہے نہ لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے جب تک ان متعدد عناصر کو ہم رشتہ کر کے نہ دیکھا جائے۔

خلیق انجم

غالب کا قیامِ بنارس

غالبؔ کا سفر کلکتہ اُن کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اپنی پنشن کے مقدمہ کے سلسلے میں وہ دلی سے کلکتے گئے تھے۔ اُنہوں نے کس سنہ میں سفر کا آغاز کیا۔ اس کے بارے میں محققین کی رائے مختلف ہے۔ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک سن بتایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جنوری ۱۸۲۶ء کے آس پاس دہلی سے روانہ ہوئے تھے اور ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس پہنچے۔ غالبؔ کے سفر کا یہ وہ زمانہ تھا جب ذرائع آمدورفت بہت محدود تھے اور عام آدمی کے لیے دہلی سے کلکتے جانا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

برطانوی حکومت کے افسران یہ سفر کرتے تھے لیکن اُن کے لیے راستے بھر مختلف مقامات پر آرامدہ بگھیوں کا انتظام ہوتا تھا۔ غالبؔ کو اپنے محدود مالی وسائل کی وجہ سے اس سفر میں گھوڑے پر بھی چلنا پڑا، پیدل بھی سفر کیا، کشتی پر بھی بیٹھے، بیل گاڑی میں بھی بیٹھے اور لڑیا میں بھی سفر کیا۔

غالب دہلی سے روانہ ہو کر فیروز پور جھر کہ پہنچے۔ وہاں کچھ حالات ایسے تھے کہ انہیں دہلی آنا پڑا اور پھر یہاں سے دوبارے فیروز پور گئے۔ فیروز پور سے غالبؔ فرخ آباد ہوتے ہوئے کانپور پھر لکھنؤ لکھنؤ سے پھر واپس کانپور، کانپور سے باندہ پہنچے۔ سفر کی ان

منزلوں کی تفصیل میں نے اپنی کتاب 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' میں دی ہے۔ باندہ میں غالب کی دوستی وہاں کی ایک مقتدر شخصیت محمد علی خاں سے ہوگئی۔ غالب نے محمد علی خاں کے نام فارسی میں جو خطوط لکھے ہیں، اُن سے باندہ سے لے کر کلکتے تک کے سفر کے حالات خاصی تفصیل سے مل جاتے ہیں۔ غالب نے باندہ کے حکمراں اور اپنے ماموں زاد بھائی نواب ذوالفقار علی خاں سے باندہ کے ایک مہاجن امی کرن سے دو ہزار روپے قرض لیے اور الہ آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ غالب نے محمد علی خاں کو دو خطوط لکھے ہیں جس میں باندہ سے الہ آباد کے سفر کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ غالب باندہ سے پیر کے دن نکلے تو اُن کی پہلی منزل مودہ تھی۔ غالب نے مودہ میں تین دن آرام کیا اور پھر وہاں سے چلّہ تارا کے لیے روانہ ہوگئے۔

جب غالب مودہ سے روانہ ہوئے تھے تو اُنہوں نے ایک چھکڑا جسے لڑیا کہتے ہیں سامان لے جانے کے لیے کرایے پر لیا اور گھوڑے سے روانہ ہوئے۔ غالب کو مودہ سے چلّہ تارا تک پہنچنے کے لیے ایک گاؤں میں رات گزارنی پڑی۔

غالب نے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''یہ چھکڑا تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور اور ضعیف نکلا۔ آہستہ خرام بلکہ ماہِ خرام کی حالت تھی۔ دن بھر میں بارہ کوس کا سفر بھی طے نہیں کر سکا یعنی مودہ سے چلّہ تارا نہیں پہنچ سکا۔ مجھے مجبوراً راستے میں ایک گاؤں میں رات گزارنی پڑی۔ منگل کی آخری شب روانہ ہوا اور دوپہر کو چلّہ تارا پہنچا۔ چلّہ تارا سے غالب کشتی کے ذریعے الہ آباد روانہ ہوگئے۔''

اس سفر کے بارے میں اُنہوں نے محمد علی خاں کو لکھا ہے:

> ''میں نے چھکڑے کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر خود کو دریا میں ڈال دیا۔ یعنی اس مقام سے میں نے یہ کشتی کرایے پر لی۔ تمام سامان، گھوڑے اور ساتھ چلنے والے لوگوں کو کشتی میں بھر کر بسم اللہ مجری ھاو مر سھا پڑھ کر دریائے جمنا میں سفر کر

رہا ہوں۔ میں بنارس میں جو وقت گزارنا چاہتا تھا، اب وہ الہ آباد میں گزاروں گا۔ یہاں چند روز آرام کر کے ضروری سامانِ فراہم کرنے کے بعد آگے کا سفر شروع کروں گا۔"

لیکن غالب پر وہاں نہ جانے کیا بیتی کہ وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ اس شہر میں نہیں رُکے۔ غالب نے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"ساتویں دن میں اس ویرانے (الہ آباد) پہنچا۔ الہ آباد! اس خرابے پر خدا کی لعنت! اور جہاں بیمار کے لیے کوئی دوا نہ ملے...... لوگ آدابِ محفل سے ناواقف ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں مرّوت اور محبت نہیں ہے۔ اس شہر کی آبادی روسیاہی کا سبب ہے۔ برباد شہر ہے۔ اس ہولناک شہر کو شہر کہنا بے انصافی ہے۔ اس شہر میں انسانوں کے ساتھ بھوت رہتے ہیں (کذا)۔ چوں کہ اس شہر کو صحنِ جہنم کے مقابل بتایا ہے، اس لیے وہ آگ سے بھر گیا ہے۔ الہ آباد میں خود کو بنارس کے قریب پہنچا دیا ہے اور گنگا کو الہ آباد کی شفاعت کے لیے اس کی طرف روانہ کیا ہے۔ ہر چند اس روسیاہ یعنی الہ آباد کی طرف دیکھنا بنارس کی طبعِ نازک پر گراں ہے لیکن چوں کہ دونوں کے درمیان گنگا ہے، اس لیے الہ آباد کے دل کو تقویت حاصل ہے۔"

"خدا کی قسم اگر دہلی جانے کے لیے واپسی پر مجھے الہ آباد سے گزرنا ہوا تو میں ترکِ وطن کر دوں گا اور وطن واپس نہیں جاؤں گا۔ قصہ مختصر ایک رات اور ایک دن اس بھوت پلیت کے شہر میں اس لیے گزارے کے وہاں بار برداری کے ذرائع نہیں مل سکتے تھے۔ اسی جرم میں مجھے الہ آباد میں قید رہنا پڑا۔"

غالب نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے:

''بحوالہ آبادو تعریفِ بنارس پر مشتمل ہے۔

ایں شکایت نامۂ آوارگی ہائے من است
قصۂ دردِ جدائی ہا، جدا خواہم نوشت

یہ تحریر میری آوارہ گردی کا شکایت نامہ ہے۔دردِ فراق کی داستان علاحدہ لکھوں گا۔
نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالبؔ نے الہ آباد سے بنارس تک کے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دوسرے دن ایک بیل گاڑی کرائے پر مل گئی۔صبح کے وقت گنگا کے ساحل پر پہنچ گیا۔ہوا کی طرح تیزی سے پانی پر سے گزرا (گنگا پار کرلی) پائے شوق کے ساتھ بنارس کی طرف سرگرم سفر ہوگیا۔جس دن بنارس پہنچا، بادۂ جانفزا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، مشرق کی طرف سے چل رہی تھی۔جس سے میری جان کو طاقت ملی اور دل میں تازگی پیدا ہوگئی۔اُس ہوا کے اعجاز نے اس غبار کو (یعنی میرے جسم کو) علمِ فتح کی طرح بلند کردیا۔''

غالبؔ نے دہلی میں اپنے ایک دوست رائے چھج مل کو سفر کی تفصیل لکھتے ہوئے چار مصرعوں کا درجِ ذیل فارسی قطعہ لکھا ہے

مغلوبِ سطوتِ شرکا غالبِ حزیں
کاندر تنش زضعف، تواں گفت جاں نہ بود
گویند زندہ تابہ بنارس رسیدہ است
مارا بہ ایں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود

(شرکا کی شوکت وسطوت سے غالبِ حزیں مغلوب ہوگیا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے کمزوری کی وجہ سے اس کے جسم میں طاقت ہی باقی نہیں تھی۔کہتے ہیں کہ وہ بنارس تک زندہ پہنچ گیا ہے۔ہمیں اس گیاہِ ضعیف سے یہ توقع نہیں تھی۔)

''طویل بیماری کے بعد جب غالبؔ بنارس پہنچے تو انہیں اچانک بیماری سے نجات مل گئی۔وہ ایک مہینے بنارس میں رہے۔اس شہر کی حیثیت غالبؔ کے لیے اس نخلستان کی بن گئی جو تپتے

ہوئے ریگستان میں طویل سفر کے بعد مسافر کے لیے فردوسِ بریں کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا ٹھنڈا پانی، ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کی حیات بخش چھاؤں، جسم اور روح کے جلتے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام ہوتی ہے۔''

غالب نے نواب محمد علی خاں کے نام بنارس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بنارس کی ہوا کے اعجاز نے میرے غبارِ وجود کو علمِ فتح کی طرح بلند کر دیا اور وجد کرتی ہوئی نسیم کے جھونکوں نے میرے ضعف اور کمزوری کو بالکل دور کر دیا مرحبا! اگر بنارس کو اس کی دل کشی اور دل نشینی کی وجہ سے میں سویدائے عالم کہوں تو بجا ہے۔ مرحبا۔ اس شہر کے چاروں طرف سبزہ و گل کی ایسی کثرت ہے کہ اگر اسے زمین پر بہشت سمجھوں تو روا ہے۔ اس کی ہوا کو یہ خدمت سونپی گئی ہے کہ وہ مردہ جسموں میں روح پھونک دے۔ اس کی خاک کا ہر ذرہ راہرو کے پاؤں سے پیکانِ خار باہر کھینچ لے۔ اگر گنگا اس کے پاؤں پر اپنا سر نہ رگڑتا تو ہمارے دلوں میں اُس کی اتنی قدر نہ ہوتی۔ اگر سورج اس کے در و دیوار سے نہ گزرتا تو اتنا تابناک اور منور نہ ہوتا۔ بہتا ہوا دریائے گنگا اُس سمندر کی طرح ہے، جس میں طوفان آیا ہوا ہو۔ یہ دریا آسمان پر رہنے والوں کا گھر ہے۔ (اس سے غالب کی غالباً مراد یہ ہے کہ اس دریا کی لہریں آسمان کو چھوتی ہیں)۔ سبزہ رنگ پری چہرہ حسینوں کی جلوہ گاہ کے مقابلے میں قدسیان ماہ تابی کے گھر کتاں کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُس شہر کے عمارتوں کی کثرت کا ذکر کروں تو وہ سراسر مستوں سے آباد ہیں اور اگر اس شہر کے اطراف سبزہ و گل کا بیان کروں تو دور دور تک بہارستان نظر آئے۔'' (فارسی سے ترجمہ)

غالب اس خط میں مزید لکھتے ہیں:

''اس تماشا گاہ میں دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ پردیس میں ہونے کا غم دل سے دور ہو گیا ہے۔اس صنم کدے سے جب ناقوس کی نشاط آفریں آواز بلند ہوتی ہے تو عجب سرور و کیف کا عالم ہوتا ہے۔بادۂ تماشا سے میرا ذوق اس قدر مخمور ہو گیا ہے کہ دہلی کی یاد بھی دل سے جاتی رہی۔یہ عجیب صورت حال درپیش ہے۔اگر دشمنوں کی خندہ زنی کا خوف نہ ہوتا تو میں ترک دین کر کے تسبیح توڑ دیتا، قشقہ لگا لیتا اور جنیو پہن لیتا اور اس وضع کے ساتھ اُس وقت تک گنگا کے کنارے بیٹھا رہتا جب تک کہ آرائش ہستی کی گرد نہ ڈھل جاتی اور قطرے کی طرح دریا میں نہ سما جاتا۔اس ارم آباد میں قدم رکھتے ہی میں نے کوئی علاج کیا نہ کوئی دوا کھائی۔پھر بھی نئے امراض کی تشویش بھی دل سے دور ہو گئی بلکہ میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اصل مرض میں بھی کچھ افاقہ ہو گیا ہے جو دوائیں کھا رہا ہوں، اُس کی وجہ آئندہ کے لیے محض احتیاط ہے۔ورنہ اس وقت صورت حال یہ ہے نہ تلافیِ ماضی منظور ہے اور نہ رعایتِ حال۔

میرے قبلہ! آپ کے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ اپنی خیرہ سری اور پریشاں نظری کی وجہ سے غالب بنارس میں اس طرح پھنس گیا ہے جیسے مکھی شہد میں یا گدھا دلدل میں پھنس جائے۔نہیں۔ہرگز نہیں۔مجھے جیسے فلک زدہ اور گرفتارِ مصیبت کے لیے کہیں اقامت کا تصور بھی ممکن نہیں۔سیر و تفریح کا کسے ہوش۔بات یہ ہے کہ مجھے یہاں قیام کرنا پڑا تا کہ جن دواؤں کی ضرورت رہتی ہے وہ حاصل کروں اور کچھ ایسا رخت سفر فراہم کروں جس کی سردی کے موسم میں ضرورت پڑتی ہے۔سرائے نیرنگ میں جو عرف عام میں سرائے نورنگ آباد کے نام سے

مشہور ہے پانچ دن بے وجہ گزار دیے۔ اُس کے بعد اسی محلے میں اُسی کارواں سرائے کے عقب میں ایک مکان مل گیا۔ یہ مکان بخیل کی قبر سے بھی زیادہ تنگ و تاریک ہے۔ یہاں سامان سفر کھول کر ایک طرف لیٹ گیا۔ ہر چند دواؤں کو ملا کر جوش دینا ایسا ہے جیسے کسی کپڑے کے پیوند پر پیوند لگانا۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ ابھی کم سے کم چار ہفتے اور میرا اس شہر میں قیام ہوگا۔ جو ہفتہ یہاں غفلت میں گزر گیا، وہ انھی چار ہفتوں میں محسوب ہوگا۔

ابھی تک پریشان ہوں کہ آگے کا سفر خشکی سے کروں یا دریا کے راستے۔ یوں سمجھ لو کہ آگ اور پانی میں گھرا ہوا ہوں۔ کبھی یہ سوچتا ہوں کہ عظیم آباد تک خشکی کے راستے جاؤں اور وہاں سے کرائے پر کشتی لوں اور کبھی خیال آتا ہے کہ یہیں سے دریا کے راستے جاؤں۔ اب آپ سے یہ امید ہے کہ آوارگانِ دشت بلا کی مدد فرمائیں اور انگریزی ڈاک سے فوراً خط ارسال فرمائیں۔ خط اس انداز سے لکھیں کہ جس سے آپ کے پورے حالات کا علم ہو سکے۔ ایسا خط نہ ہو جس کے آغاز میں خیریت، عافیت تحریر ہو اور بس۔ خدا جانتا ہے کہ میں آپ کو اکثر یاد کرتا رہتا ہوں۔

انشاء اللہ العزیز، میں آپ کے خط کے جواب میں جو خط لکھوں گا اُس میں یہاں سے روانگی کی تاریخ لکھوں گا اور یہ بھی لکھوں گا کہ میں کس راستے سے آگے جاؤں گا۔"

غالبؔ بنارس میں جس مکان میں مقیم تھے، وہ اس قابل نہیں تھا کہ غالبؔ اپنے دوست نواب محمد علی خاں کو اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے غالبؔ کو شرم آتی تھی نیز اس مکان کا پتا لکھنا بھی۔ غالبؔ کو اس مکان کی تفصیل اور پتا ان الفاظ میں لکھنا پڑا۔

''ہر چند میں اصرار کر رہا ہوں کہ آپ خط ضرور تحریر فرمائیں۔لیکن دل گمنامی اور ہیچ کسی کی شرم سے ہزار خنجروں سے زخمی ہے۔ کیونکہ میں جس مکان میں مقیم ہوں، وہ ایک بوڑھی عورت کا ہے۔وہ اتنی غریب ہے کہ اُس کے چراغ میں تیل بھی نہیں ہے ......اُس گاؤں کی طرح ہے جو خراج کی ادائیگی کے خوف سے ویران ہوگیا ہو۔اس کے آس پاس کوئی بازار ہے اور نہ کوئی شاندار گھر، جس کے حوالے سے لوگ یہ مقام تلاش کرسکیں۔لہٰذا خط کا پتا کیا لکھا جائے۔کوئی نامہ بر، خواہ پیک خیال ہی کیوں نہ ہو۔کس پتے سے یہاں پہنچے گا۔

مخدومی! مکتوب کو مکتوب الیہ کے ساتھ خدا کے سپرد کر کے یہ پتا تحریر فرمادیں۔

محلّہ نورنگ آباد۔عقب سرائے نورنگ آباد، قریب حویلی گوسی خانساماں مٹھالی اور میاں رمضان کی حویلی میں۔اسداللہ غریب الوطن تازہ وارد کو ملے۔'' (فارسی سے ترجمہ)

غالب جب بنارس پہنچے ہیں تو پانچ دن تک سرائے نیرنگ آباد میں جسے عام طور پر نورنگ آباد کہتے ہیں، مقیم رہے۔اس کے بعد انہوں نے نورنگ آباد کے عقب میں میاں رمضان اور مٹھالی کی حویلی میں گوسی خانساماں کی حویلی سے ملحق ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

غالب کے لیے بنارس شہر کی حیثیت اس نخلستان کی تھی جو تپتے ہوئے ریگستان میں طویل سفر کے بعد مسافر کے لیے فردوسِ بریں کا درجہ رکھتا ہو جس کا ٹھنڈا پانی، ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کی حیات بخش چھاؤں جسم اور روح کے جلتے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہے۔

دہلی سے کلکتے تک کے اس انتہائی تکلیف دہ سفر کی غالب کی فارسی مثنوی 'چراغِ دیر' ہے۔اس مثنوی کا شمار ہندوستان کے فارسی ادب کے اعلا شہ پاروں میں ہوتا ہے۔بنارس شہر کو شاید ہی کسی اور نے غالب سے بہتر خراجِ تحسین پیش کیا ہو۔ایک سو آٹھ

اشعار میں اُنہوں نے بنارس کی تمام مادّی اور روحانی خوبیوں کا اِحاطہ جس طرح کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اس فارسی مثنوی کے کئی اردو ترجمے ہوئے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ وہ ترجمہ پسند ہے جو ڈاکٹر حنیف نقوی نے کیا ہے، اس میں اپنی کتاب 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' میں اور اس مقالے میں حنیف نقوی صاحب کے ترجمہ کیے ہوئے اشعار نقل کیے ہیں۔ اب اس مثنوی کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوا ہوں گھر سے میں ہر چند بے گھر
بھلایا مجھ کو ان لوگوں نے کیوں کر
چمن کے چھوٹنے کا رنج کم ہے
مجھے بے مہری یاراں کا غم ہے
چمن میں بہرِ تعمیرِ نشیمن
بہت ہے ایک شاخِ گل کا دامن

اس وقت غالب کی نظر میں وہ ''شاخِ گل کا دامن'' جس پر غالب اپنا آشیانہ بنا سکتے تھے، بنارس شہر تھا۔ اس شہر کی تعریف میں غالب لکھتے ہیں:

نظر میں آج اک ایسا چمن ہے
جو رنگ و نور و نکہت کا وطن ہے
وہاں تک جب سے پائی ہے رسائی
نگہ کو دعویِ گلشن ادائی
یہ اس کے وصف کا فیضِ نمو ہے
زباں جنت طرازِ گفتگو ہے
بنارس نام اُس کا، چشمِ بد دور
بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور

اس کے بعد غالب تناسخ کے عقیدے کے بارے میں کہتے ہیں کہ جو لوگ تناسخ کے فلسفے کے ماننے والے ہیں، اُن کا عقیدہ ہے بنارس ایسا مقدس شہر ہے کہ جن لوگوں کی

روح اس سرزمین پر تنِ خاکی سے پرواز کرتی ہے، انہیں آواگون سے نجات مل جاتی ہے۔ بقول غالب:

تناسخ ہے جن لوگوں کا ایماں
وہ ہیں یوں ارضِ کاشی کے ثنا خواں
نکلتی ہے یہاں جب روح تن سے
تو پاتی ہے نجات آوا گون سے
بہار آتی ہے نخلِ آرزو پر
حیاتِ جاوداں ملتی ہے مر کر

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ بنارس آنے سے پہلے غالب طویل عرصے تک بیمار رہے تھے، لیکن بنارس پہنچے تو انہیں اس شہر کی آب وہوا ایسی راس آئی کہ مرض میں بڑی حد تک افاقہ ہوگیا، اس لیے غالب بنارس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''پھولوں کی اس سرزمین پر میرا دل آیا ہے۔ کیا اچھی آبادی ہے، جہاں بہار کا چلن ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ دہلی جیسا شہر اس کا طواف کرنے آتا ہے۔ سبحان اللہ، بنارس کو خدا نظر بد سے بچائے۔ یہ ایک مبارک جنت ہے، یہ بھرا پرا فردوس ہے۔ اس شہر کی گھانس پھونس بھی گویا باغ ہے اور اس کا گرد وغبار بھی روح کا لطیف غبار ہے۔ دنیا کے اس پرانے بت کدے میں جو ہمیشہ رنگ بدلتا رہتا ہے، بنارس کی بہار رنگ کی تبدیلی سے محفوظ ہے۔ چاہے بہار کا موسم ہو، خزاں کا ہو یا گرمی کا، ہر موسم میں یہاں کی فضا جنت بنی رہتی ہے۔''

اس مثنوی میں ایک اور مقام پر بنارس کی تعریف کس خوب صورت انداز میں کی ہے۔ غالب کہتے ہیں:

بنارس شاہدِ رنگیں قبا ہے
یہ گنگا، اُس کا گویا آئینہ ہے

فلک نے رکھ کے حسن اس کا نظر میں
جڑا ہے آئینہ سورج کا زر میں
خدا رکھے یہ شانِ حسنِ کامل
نہیں جز آئینہ جس کا مقابل
یہ جلوہ گاہِ حسنِ لا ابالی
جہاں میں ہے مثالِ بے مثالی
خوشا گنگا میں یہ پرتو فشانی
بنارس خود بنا ہے اپنا ثانی
دراصل اس رہنمائی کے بہانے
اتاری ہے نظر دستِ قضا نے
کہ ہے ارژنگِ چیں میں سحر ایسا
یہ ہے دنیا میں کوئی شہر ایسا
چمن اس کے بیاباں در بیاباں
بہار اس کی گلستاں در گلستاں

غالبؔ نے دو شعروں میں بنارس کو بت پرستوں کا حرم، زیارت گاہ مستاں، عبادت خانۂ ناقوسیاں اور کعبۂ ہندوستاں کہا ہے۔

حریم بُت پرستاں ہے یہ خطّہ
زیارت گاہِ مستاں ہے یہ خطّہ
عبادت خانۂ ناقوسیاں ہے
یہ گویا کعبۂ ہندوستاں ہے

غالبؔ بنارس کی تعریف میں طرح طرح کی خوب صورت تشبیہیں واستعارے استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یوں کہو بنارس ایک دلربا حسین ہے جس کے ہاتھ میں سنگھار کے لیے صبح وشام گنگا کا آئینہ رہتا ہے۔ اس پری چہرہ یعنی بنارس

کے چہرے کا عکس اتارنے کے لیے آسمان نے سورج کا آئینہ سونے سے بنایا ہے۔نامِ خدا اس کا حسن و جمال کیسا ہے کہ آئینے میں اس کا عکس رقصاں ہے(گویا بنارس شہر کی کچھ عمارتوں کا جب گنگا میں عکس پڑتا ہے تو وہ لرزتا ہے)۔جب بنارس شہر نے دریاے گنگا میں اپنا عکس ڈالا تو آپ ہی اپنی نظیر بن گیا اور جب پانی کے آئینے میں اس کی صورت دکھادی تو اب اس کو بری نظر لگنے کا اندیشہ نہیں رہا۔چین کے ملک میں بنارس جیسا نگارستان نہیں ہوگا۔چین تو کیا ساری دنیا میں ایسا شہر نہیں ہوگا۔بنارس شہر کے جنگل جنگل لالہ زار بھرے ہوئے ہیں اور اس کی بہاریں گلستاں درگلستاں ہیں۔''

اس کے بعد غالب بنارس کی تعریف کا ایک نیا پہلو نکالتے ہیں:

''میں نے ایک رات ایک ایسے شخص سے جو روشن بیان تھا اور زمانے کی گردشوں کے راز سے واقف تھا۔پوچھا کہ آپ دیکھتے ہیں۔دنیا سے نیکی غائب ہوگئی۔وفا،محبت،دل جوئی دنیا میں باقی نہیں رہی۔ایمان کا صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے۔جعل اور فریب کے سوا کام نہیں چلتا۔باپ بیٹوں کے خون کے پیاسے ہیں اور بیٹے اپنے باپ کی جان کے دشمن..... بھائی بھائی سے اُلجھا ہوا ہے اور محبت ساری دنیا سے غائب ہوتی جارہی ہے۔ پانچ اشعار میں غالب روشن بیان سے اپنا یہ سوال کرکے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی ایسی کھلی نشانیاں موجود ہیں۔پھر قیامت کیوں نہیں آجاتی۔قیامت کا صور پھونکنے میں اب کاہے کی دیر ہے۔ قیامت کو کس نے روک رکھا ہے۔''

غالب بڑے خوب صورت انداز میں اس روشن بیان انسان کی طرف سے جواب دیتے ہیں کہ:

"وہ بنارس اس کی طرف اشارہ کر کے مسکرا دیا اور اس نے کہا کہ
اس شہر کی آبادی قیامت کو روکے ہوئے ہے۔ دنیا کے بنانے
والے کو یہ منظور نہیں ہے کہ اس رنگین اور خوب صورت آبادی کو
تباہ و برباد کر دے۔ بنارس کا وقار اتنا بلند ہے کہ قوت خیال اس
کی چوٹی تک نہیں پہنچ پاتا۔"

دہلی سے کلکتے تک غالبؔ کو دو شہر لکھنؤ اور الہ آباد نفرت کی حد تک برے لگے۔ ایک تو لکھنؤ جسے انہوں نے ستم آباد کہا ہے اور دوسرا الہ آباد جسے اُنہوں نے 'غیر شائستہ اور غیر مہذب لوگوں کا شہر'، 'ہولناک وادی'، 'رُو سیاہ'، 'لعنت خدا بر آن خرابہ باد' لکھا ہے۔ نواب محمد علی خاں کے نام ایک فارسی خط کا آغاز الفاظ میں کیا ہے:

ہجوالہ آباد و تعریفِ بنارس

ایں شکایت نامۂ آوارگی ہائے من است　　　　قصۂ دردِ جدائی ہا، جدا خواہم نوشت

یعنی یہ تحریر میری آوارہ گردی کا شکایت نامہ ہے۔ درد فراق کی داستان علاحدہ لکھوں گا۔ اس کے برعکس غالبؔ کو سفر کے دوران دو شہر پسند آئے۔ ایک تو عظیم آباد (پٹنہ) اور دوسرا بنارس۔

غالبؔ نے کلکتے میں بائیس (۲۲) اشعار کا ایک قطعہ کہا تھا۔ اس قطعے میں غالبؔ کے دو شعر ہیں:

گفتمش چوں بُوَد عظیم آباد
گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش چیست ایں بنارس؟ گفت
شاہدے مستِ محوِ گل چیدن

جن دنوں غالب بنارس میں تھے بظاہر اُن کا سرپرست، مداح، عقیدت مند یا شاگرد اُس شہر میں نہیں تھا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ غالبؔ نے بنارس میں اتنے دن کیوں قیام کیا اور بنارس کی اتنی تعریف کیوں کی۔ غالبؔ بنارس میں گمنام زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ اُن کے مزاج کے قطعاً خلاف تھا۔

مالک رام صاحب اور قاضی عبدالودود نے غالبؔ کے قیامِ بنارس کے بارے میں لکھا ہے کہ شاید غالبؔ کسی غارت گرِ ہوش پر فریفتہ ہو گئے تھے اور غالبؔ کے بنارس میں قیام کی وجہ وہی غارت گرِ ہوش تھا۔ بنارس سے روانہ ہونے کے بعد کافی عرصہ تک غالبؔ اُس غارت گرِ ہوش کو فراموش نہیں کر سکے۔

غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے خط میں ایک قطعہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

کاش، کان بتِ کاشی در پزیر دم، غالب
بندۂ توام گویم، گویدم زِناز، آری

(کاش بنارس کا وہ حسین بت مجھے قبول کر لے۔ میں کہوں کہ میں تیرا غلام ہوں اور وہ ناز سے کہے بے شک۔)

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی غارت گرِ ہوش کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے، اس لیے غالبؔ کے قیامِ بنارس میں اتنے دن لگے۔

حنیف نقوی

بنارسی کی دوستی

مرحوم قاضی عبدالودود نے ۱۹۶۹ء کے غالب صدی سمینار کے خطبۂ افتتاحیہ میں غالبؔ کی بعض تحریروں کے ابہام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''بہت سی باتیں محض اشاروں میں ہیں۔ مثلاً علائیؔ کے نام سے ایک خط میں ہے کہ میں نے بنارسی کی حمایت میں گالیاں کھائیں۔ علائیؔ کسی شخص کو سائیسوں سے پٹوانا چاہتے تھے۔ غالبؔ مانع ہیں۔ خبر نہیں وہ شخص کون تھا اور علائیؔ کی ناراضی کا سبب کیا تھا؟''

اس کے تقریباً تیس سال کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد کے اکتوبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں بنی مادھو رسوا کے فرضی نام سے اپنی ایک نہایت دلچسپ تحریر ''غالب افسانہ'' شائع کی۔ اس سوانحی افسانے میں رسوا اور غالب کی ملاقات کے دوران ملا محمد عمر سابقؔ بنارسی کے بارے میں غالبؔ کا ایک مکالمہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

''ملا سابق علیہ الرحمہ کے نام سے واقف ہوں۔ان کی مثنوی ''تاثیرِ محبت''میں نے اپنے بنارس کے قیام میں دیکھی تھی۔بڑے جید آدمی تھے''۔ ؎

رسالے کے مئی جون ۱۹۹۹ء کے مشترک شمارے میں ''کہتی ہے خلقِ خدا'' کے مستقل عنوان کے تحت ڈاکٹر گیان چند جین کا ایک طویل خط شائع ہوا ہے۔اس میں انہوں نے منقولہ بالا دونوں تحریروں کے حوالے سے اپنے مشاہدات وتاثرات سپردِ قلم کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''آج کل میں قاضی عبد الودود کی تحریروں میں مستغرق ہوں،بالخصوص ان کی غالبیات میں۔(اس سلسلے میں) آپ سے جو مدد ملی ہے،اس کا ذکر کرتا ہوں۔قاضی صاحب نے دہلی میں غالب انٹر نیشنل سمینار ۱۹۶۹ء میں اپنا طویل افتتاحی خطبہ پڑھا۔اس میں کہا کہ غالبؔ نے علائیؔ کے نام کے ایک خط میں کہا ہے کہ میں نے بنارسی کی حمایت میں گالیاں کھائیں۔انہوں نے خط کی تفصیل نہیں دی۔بہر حال میں نے تلاش کیا۔خلیق انجم کے مرتبہ ''غالبؔ کے خطوط'' جلد اول،خط ۵۳ میں لکھا ہے: ''ایک بار میں نے دکنی کی دشمنی میں گالیاں کھائیں،ایک بار بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھاؤں گا۔'' یہاں دکنیؔ سے مراد فارسی کی لغت ''برہانِ قاطع'' کا مولف محمد حسین برہانؔ ہے۔بنارسی کون ہے؟ قاضی عبدالودود کو معلوم نہ تھا۔جاننا چاہتے تھے۔میں بھی واقف نہ تھا۔نومبر ''شب خون'' کے ''سوانحی گوشے''میں آپ نے خان آرزو کے شاگرد ملا سابقؔ بنارسی (۱۷۳۰ء۔۱۸۱۰ء) کا ذکر کیا ہے۔اب بات صاف ہوگئی۔جنوری کے ''شب خون'' میں قاضی افضال حسین نے اپنے مراسلے میں لکھا ہے:

''.....ملا سابق بنارسی شمس الرحمٰن فاروقی کے نانہالی جدّ اعلیٰ
تھے، اور اگرچہ مشہور آدمی تھے مگر غالباً مرزا غالب سے ان کا کوئی
معاملہ نہ تھا۔''

معاملہ تو تھا۔ غالب نے علائی کے نام کے خط میں بنارسی کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے رسوا کے نام کے ''غالب افسانہ'' میں غالب کی زبانی کہلایا ہے:

''ملا سابق علیہ الرحمہ کے نام سے واقف ہوں۔ ان کی مثنوی ''تاثیرِ محبت'' میں نے اپنے بنارس کے قیام میں دیکھی تھی۔ بڑے جیّد آدمی تھے۔''

لکھیے کہ یہ سب آپ نے کہاں سے لیا ہے؟ یہ حوالہ بنارسی کی شناخت اور غالب سے ان کی دوستی کے ثبوت کے لیے مفید ہوگا۔ قاضی عبدالودود فارسی ادبیات کے بڑے عالم تھے۔ آپ نے تو انہیں بھی زک دے دی۔'' ۶

جین صاحب کے ان ارشادات پر اظہار خیال سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علائی کے نام غالب کے اس خط پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جس کے حوالے سے ''بنارسی'' کی شناخت کا یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے۔ مرزا غالب نے اس خط میں لکھا ہے:

''ضمناً ذکر ایک مدبر کا لکھا جاتا ہے۔ جو تم نے اس مدبر کے
صفات لکھے، سب سچ ہیں۔ احمق، خبیث النفس، حاسد، طبیعت
بری، سمجھ بری، قسمت بری۔ ایک بار میں نے دکنی کی دشمنی میں
گالیاں کھائیں، ایک بار بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھاؤں
گا۔ میں نے جو تمہیں اس کے باب میں لکھا تھا، وجہ اس کی یہ تھی
کہ میں نے سنا تھا کہ تم نے اپنے سائیسوں سے کہہ دیا ہے یا کہا
چاہتے ہو کہ اس کو بازار میں بے حرمت کریں۔ یہ خلافِ شیوۂ
مومنین ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ قصد نہ کرنا۔ یہ موید اُس قول کا ہے
جو میں نے تم سے پہلے کہا تھا کہ تم یوں تصور کرو کہ اس نام کا آدمی
اس محلّے میں بلکہ اس شہر میں کوئی نہیں۔'' ۷

اس خط میں تین اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی یہ کہ اس میں جس ''بنارسی'' کی

دوستی میں گالیاں کھانے کا ذکر آیا ہے، وہ اس وقت بہ قیدِ حیات تھا اور دہلی میں موجود تھا۔ دوسری یہ کہ غالبؔ اور علائیؔ کی طرح عقائد کے اعتبار سے وہ بھی اثنا عشری تھا۔ اس کی سرکوبی کو "خلافِ شیوۂ مومنین" قرار دینا اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ تیسری یہ کہ وہ دہلی میں غالب اور علائیؔ کا ہم محلہ یعنی بلّی ماران کا باشندہ تھا۔ اس پس منظر میں غور کیا جائے تو جین صاحب کے فرمودات سے اتفاق کی مطلقاً کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ ملا محمد عمر سابقؔ بنارسی نہ تو غالبؔ کے ہم محلّہ تھے اور نہ ہم عصر۔ وہ ۱۸۱۰ میں یعنی اس خط کی تحریر سے تقریباً ساٹھ سال پہلے وفات پا چکے تھے۔ علاوہ بریں وہ سنّی العقیدہ تھے اور اہلِ علم ان کی کسی ایسی کارگزاری سے واقف نہیں جس کی تائید یا حمایت کا خمیازہ ان کے کسی دوست کو گالیوں کی صورت میں بھگتنا پڑا ہو۔ اس وضاحت کے بعد جین صاحب کے یہ مزعومات از خود بے معنی ہو جاتے ہیں کہ فاروقیؔ صاحب نے ملا محمد عمر سابقؔ بنارسی کی شخصیت سے پردہ اٹھا کر بنارسی کی شناخت اور غالبؔ سے ان کی دوستی کا مسئلہ بڑی حد تک حل کر دیا ہے اور اپنی اس دریافت کے ذریعے انہوں نے قاضی عبدالودود کو بھی جو فارسی ادبیات کے بڑے عالم تھے، زک دے دی ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں تحقیق کا دائرہ اگر صرف علائیؔ کے نام غالبؔ کے خط تک محدود رکھا جائے تو زیرِ بحث مسئلے کا حل بہ آسانی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اس خط کے پس منظر میں ہمارا ذہن بار بار جس شخص کی طرف منتقل ہوتا ہے وہ صرف اور صرف مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ بنارسی ہیں۔ اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ غالبؔ کے حلقۂ احباب و تلامذہ میں ان کے علاوہ ایسا کوئی اور شخص نظر نہیں آتا جو بنارس سے وطنی نسبت رکھتا ہو اور جس کی خاطر انہیں بے حد عزیز ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دہلی میں ان کا قیام محلّہ بلّی ماران میں غالبؔ کے پڑوس ہی میں تھا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کی طرح وہ بھی اثنا عشری عقیدے کے پیرو تھے اور ایّامِ عزا میں باقاعدہ مرثیہ خوانی کیا کرتے تھے۔ چوتھا اور سب سے اہم سبب یہ ہے کہ غالبؔ کو زبان و لغت کے بعض مسائل میں "برہانِ قاطع" کے مولّف محمد حسین دکنی سے اختلاف کی بنا پر ان کے حامیوں کی مذمّت و ملامت کا ہدف بننا پڑا تھا۔ عزیزؔ کو بھی اپنے زمانے کے معروف اساتذۂ سخن اور زبان دانوں پر خواہ مخواہ اعتراض اور ان کی

اصلاح کا عارضہ لاحق تھا جس کے نتیجہ میں کبھی کبھی نوبت بحث وتکرار اور مناقشے اور معارضے تک پہنچ جاتی تھی۔

مرزا غالب یوسف علی خاں عزیز کو کس قدر عزیز رکھتے تھے، اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیانات سے کیا جاسکتا ہے۔ منشی نبی بخش حقیر کو ۲۳ر جنوری ۱۸۵۲ء خط میں لکھتے ہیں:

''مرزا نجف علی خاں مرحوم...... کے فرزندِ ارجمند مرزا یوسف علی خاں کو میں اپنے فرزند کی جگہ مانتا ہوں، اور ان کی سعادت مندیاں اور خوبیاں کیا بیان کروں کہ میں ان کا عاشق ہوں۔''

منشی شیونرائن آرام کے نام ۶ر نومبر ۱۸۵۹ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

''مرزا یوسف علی خاں عزیز...... عالی خاندان اور ناز پروردہ آدمی ہیں۔ ان کو جو راحت پہنچاؤ گے اور جو ان کی خدمت بجالاؤ گے، اس کا خدا سے اجر پاؤ گے۔''

مرزا حاتم علی مہر کو ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مرزا یوسف علی خاں آٹھ دس مہینے سے مع عیال واطفال اسی شہر میں مقیم ہیں۔ ایک ہندو امیر کے گھر پر مکتب کا ساطور کر لیا ہے۔ میرے مسکن کے پاس ایک مکان کرائے کو لے لیا ہے، اس میں رہتے ہیں...... وہ اب ہر وقت یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ رات کو تو پہر چھ گھڑی کی نشست روز رہتی ہے۔''

حبیب اللہ ذکا کے نام ۲۴ر دسمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''یوسف علی خاں شریف وعالی خاندان ہیں۔ بادشاہِ دہلی کی سرکار سے تیس روپے مہینا پاتے تھے۔ جہاں سلطنت گئی، وہاں تنخواہ بھی گئی۔ شاعر ہیں، ریختہ کہتے ہیں، ہوس پیشہ ہیں، مضطر ہیں۔ ہر مدّعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں علم اسی قدر ہے کہ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا باپ میرا دوست تھا۔ میں ان کو بجائے فرزند سمجھتا ہوں۔ بہ قدر اپنی دستگاہ کے کچھ مہینا مقرر کر دیا ہے

مگر بہ سببِ کثرتِ عیال وہ ان کو مکتفی نہیں۔''

ان کے علاوہ مختلف دوستوں اور شاگردوں کے نام کے اور بھی کئی خطوط میں عزیزؔ کا ذکر موجود ہے، جس سے ان کی بے روزگاری اور پریشاں حالی پر غالبؔ کی فکرمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ خود عزیزؔ کے نام غالب کے خطوط کی مجموعی تعداد کل تین ہے۔ ان میں دو خطوں میں صرف زبان اور لغت کے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ دوسرے خط میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ''پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے، تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔'' اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عزیزؔ اس وقت بنارس آئے ہوئے تھے اور حسبِ عادت کسی لفظ کی تذکیر و تانیث پر اپنے کسی شناسا یا بزرگ سے جھگڑا کر بیٹھے تھے۔ چناں چہ اس خط کے آخر میں مرزا صاحب نے انہیں یہ نصیحت بھی فرمائی ہے کہ

''تم اپنی تکمیل کی فکر میں رہا کرو۔ زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔''

لیکن انہوں نے اس نصیحت یا مشورے پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور تا عمر اپنی اسی مخصوص روش پر قائم رہے۔ عبدالغفور نساخؔ ان کی اس سلسلے کی ایک کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں میں بہت سی غلطیاں نکالی ہیں اور ان کے بہت سے مرثیوں کا جواب لکھا ہے۔''[۵]

لالہ سری رام نے یہی بات ان الفاظ میں دوہرائی ہے:

''مرثیہ گوئی کا بڑا شوق تھا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں میں اکثر جگہ جا و بے جا غلطیاں نکالی ہیں۔''[۶]

اسی قسم کا ایک اور واقعہ انہوں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''قصۂ شہزادہ ممتاز کو فارسی سے زبانِ سلیس اردو سید ظہیرالدین حسین صاحب ظہیرؔ دہلوی نے بہ فرمائش حکیم صاحب موصوف (حکیم احسن اللہ خاں) ترجمہ کیا تھا، جس کے صلے میں بادشاہِ دہلی نے خطاب و خلعت عنایت فرمایا تھا۔ اتفاق سے وہ قصہ حکیم صاحب سے بندا عل عطار چھاپنے کے لیے لے آئے

اورمرزا صاحب کے حوالے کیا کہ روز مرّہ درست
کردیں۔ پینتیس روپے اجرت کے ٹھہرے۔ حضرت نے قصۂ
مذکور کو گھر لے جا کر جا و بے جا خوب اصلاح کی۔ جب اپنے زعم
میں عیوب و نقائص سے پاک کر چکے، لالہ صاحب کو دے
آئے۔ ان سے لے کر جنابِ ظہیرؔ نے بھی ملاحظہ کیا اور ایک
کاغذ پر جو غلطیاں سمجھ کر مرزا صاحب نے اصلاح دی تھی، اس کو
اور اپنے ترجمے کو بہ طور محضر لکھ کر فصحا و بلغاے دہلی کو دکھایا۔ ازراہِ
اتفاق سب نے میر صاحب کے محاورات کو درست و صحیح قرار
دیا۔ اب میر صاحب کا ارادہ ہوا کہ بہ ذریعہ اخبار و خطوط اہلِ
لکھنؤ سے اس کی تصدیق کرائیں۔ مرزا عزیزؔ نے جو سنا، فوراً ان
کے پاس آئے اور بہ منّت کہا کہ میں غریب آدمی ہوں۔ جو کچھ
ہوا، ازراہِ ضرورت ہوا۔ آپ معاف فرمائیں۔ میر صاحب نے
مروّت کی رو سے درگزر کی اور وہ محضر چاک کر ڈالا۔ قصّہ مختصر ان
کے مزاج میں کسی قدر مراق تھا۔''[۲]

لالہ سری رام کے اس بیان کے ساتھ یہ دیکھ لینا بھی مناسب ہوگا کہ ظہیرؔ کے اس ترجمے کی اصلاح کے سلسلے میں خود مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''قصۂ ممتاز'' کے دیباچے میں ''نوا سنجی بلبلِ خوش صفیرِ کلک بہ اضطراب مع باعثِ تصحیح اغلاطِ فقراتِ کتاب'' کے زیرِ عنوان اپنے حسنِ بیان و لطفِ زبان کی ستائش کے بعد رقم طراز ہیں:

''قدر افزاے اہلِ ہنر، سخن شناسِ نکتہ پرور...... احترام الدولہ،
عمدۃ الملک، حاذق الزماں، حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر ثابت
جنگ کہ انہوں نے بہ مقتضاے عنایت و بہ راہِ عاطفت، بادشاہِ
جم جاہ، ولی نعمت، حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہِ
غازی سے مجھ ننگِ خاندان، عار دودمان کو بہ نذر مرثیہ وقصیدہ

خلعتِ فاخرۂ چار پار چہ وسہ رقم جواہر جیغہ وسر پیچ وگوشوارہ بہ خطابِ باصواب سلطان الذاکرین وسراج الشعر انامِ نامی حضرت سے دلوایا۔ ناگاہ بہ ذریعہ رقعۂ فیض مرقعہ وقتِ تشریف بری سمتِ قصبۂ کرولی مجھ ہیچ مداں ضعیف البنیان کو خدمتِ عالی درجت میں بلا کر واسطے تصحیح وتبدیل الفاظِ غیر مانوس اور فقراتِ نامربوطِ قصۂ عجیب وفسانۂ غریب ممتاز شاہِ انجم سپاہ کے کہ اس کو زبانِ فارسی سے زبانِ اردو میں بہ موجبِ فرمانِ واجب الاذعان جناب حکمت مآب ممدوح کے اور بہ نظر حصولِ صلۂ موعود کے سید ظہیر الدین حسین متخلص بہ ظہیر نے بہ فصاحتِ تمام وملاحتِ مالا کلام ترجمہ کیا ہے، اکثر وبیشتر سخن فہموں کو بہ سبب بے محاورہ ہونے عبارت کے پسند نہ آیا اور موعودِ مفوضہ رائگاں گیا، اس نظر سے فرمایا۔ چناں چہ حسب الارشاد ان کے اور موافقِ استعداد اپنی بہ ہزار دقت وخرابی وبسیار محنت واضطرابی جو کچھ میرے فہمِ ناقص میں آیا، دیباچہ براعت الاستہلال میں، سببِ تصحیح حزن وملال میں لکھ کر تصرف کیا اور جا بہ جا بنایا۔ ہر چند وہ ترجمہ بادی النظر میں بہ ہمہ صفت موصوف اور عیوب ونقصِ ظاہری سے پاک وصاف تھا ولیکن ہر گاہ بہ نظر امتحان دیکھا تو محاورۂ اردو کے بر خلاف تھا۔ واضح ہوا کہ اکثر مقامات میں حاجتِ اصلاح تھی اور اس میں تصحیح کرنے والے کی فلاح تھی۔ لاجرم اس بے نام ونشاں نے بنابرِ امتثالِ امرِ جلیل القدر مجبور، غلطیوں کو دور کیا اور حتی المقدور صحتِ کاملہ سے معمور کیا۔'' [۵]

مثنوی ''حقیقتِ حال'' میں بھی عزیز نے اپنے اس بیان کو دوہرایا ہے کہ ظہیر دہلوی کے ترجمے کی اصلاح کا یہ کام بہ ذاتِ خود حکیم احسن اللہ خاں نے ان کے سپرد کیا

تھا۔ لکھتے ہیں:

حسن اللہ خانِ با اعزاز دے گئے مجھ کو قصہ ممتاز
تامیں اغلاط اس کی دور کروں نورِ معنی سے رشک طور کروں

ان بیانات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تصحیح اغلاط و اصلاحِ عبارات کے اس کام میں لالہ سری رام کی روایت کے برخلاف لالہ بنداہل عطاّر کی فرمائش کا کوئی دخل نہ تھا۔ عزیز نے یہ خدمت اپنے مربی و سرپرست حکیم احسن اللہ خاں کے حسب خواہش انجام دی تھی۔ البتہ "قصہ ممتاز" کے میور پریس، دہلی سے ۱۸۸۳ء میں شائع شدہ ایک ایڈیشن کے خاتمۃ الطبع میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ "قصہ لاجواب ...... حسب اجازتِ محبِ بے بدل، جناب حکیم بنداہل صاحب، شاگردِ رشیدِ احترام الدولہ...... حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر مرحوم...... رونقِ انطباع پا کر فائدہ بخشِ خاص و عام ہوا" ہے اس بنا پر ہمارا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب نے ازراہِ شاگرد نوازی لالہ بنداہل کو اس قصے کی اشاعت کی اجازت عطا فرمادی ہوگی اور اس پر نظر ثانی کی خدمت عزیز کے سپرد کر کے لالہ صاحب کو پابند کر دیا ہوگا کہ وہ انہیں اس کا مناسب حق المحنت ادا کر دیں۔

"قصہ ممتاز" کی اصلاح اور طباعت کے اس کام میں لالہ بنداہل عطاّر کی اعانت میں حکیم صاحب کی توجہ خاص کا ذکر مجملاً مثنوی "حقیقتِ حال" میں بھی موجود ہے۔ کرولی میں مختصر قیام کے بعد جب عزیز وہاں سے دہلی واپس آرہے تھے تو حکیم صاحب نے انہیں رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دعوت کا حال بیان کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

ہاتھ دھو، پان کھا، پیا حقہ بنداہل کے لیے لیا شقہ
تھے یہ دلی میں نامور عطاّر اس سے اس نسخے کا تھا مجھے کار

"قصہ ممتاز" کے تین مختلف ایڈیشن اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہی ۱۸۸۳ء کا ایڈیشن ہے جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ ایک اور ایڈیشن اسی مطبع میور پریس، دہلی سے "قصہ ممتاز باتصویر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں کسی جگہ اس کا سالِ طباعت درج نہیں اور کسی غلط فہمی کے باعث سرورق پر کتاب کو "من تصنیفِ

جناب حکیم احسن اللہ خاں صاحب، وزیر اعظم بہادر شاہ مرحوم شاہِ دہلی ''لکھ دیا گیا ہے۔اس بیان سے ضمناً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشاعت بہادر شاہ ظفر کی وفات (۷رنومبر ۱۸۶۲ء) کے بعد لیکن حکیم احسن اللہ خان کے انتقال (ستمبر ۱۸۷۳ء) سے قبل منظرِ عام پر آچکی تھی۔تیسرا ایڈیشن ۱۸۹۱ء کا مطبوعہ ہے۔اسے مطبعِ جیون پرکاش، دہلی نے شائع کیا تھا۔ثانی الذکر ایڈیشن کی طرح یہ بھی ''قصہء ممتاز با تصویر''ہی کے نام سے شائع ہوا ہے۔اس کا سر ورق ''شبیہِ مبارک حضرت ابو ظفر محمد سراج الدین ، بہادر شاہ، بادشاہ دہلی، نوراللہ مضجعہ'' سے مزین ہے۔ان تینوں ایڈیشنوں میں عزیز کے دیباچے کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ لالہ سری رام کا یہ بیان بھی پوری طرح درست نہیں کہ ''جب عزیز اس قصے کو عیوب ونقائص سے پاک کر کے لالہ (بنداِمل) صاحب کو دے آئے تو ان سے لے کر جناب ظہیر نے بھی دیکھا۔'' قیاس یہ کہتا ہے کہ ظہیر کو عزیز کی اس کارگزاری کا علم اصلاح شدہ مسودہ لالہ بنداِمل کے حوالے کرنے کے فوراً بعد نہیں، کتاب کی اشاعت کے بعد ہوا ہوگا ورنہ عزیز کے معافی مانگ لینے کی صورت میں اس کا علی حالہ شائع ہو جانا ممکن نہ ہوتا۔

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لالہ سری رام نے اپنے بیان میں ظہیر دہلوی کے تیار کیے ہوئے جس محضر کا ذکر کیا ہے، غالباً وہی اس فساد کا اصل محرک تھا جو ایک طرف علائی کی برافروختگی کا سبب بنا اور دوسری طرف معاندینِ غالب کو ان کے خلافِ طنز وتعریض کا ایک حربہ فراہم کر گیا۔اس محضر پر جن ''فصحا و بلغاے دہلی'' سے استصوابِ راے کیا گیا تھا، یقین ہے کہ ان میں غالب بھی شامل ہوں گے اور علائی بھی۔قیاس یہ کہتا ہے کہ غالب نے ذوق کے شاگرد ظہیر کے مقابلے میں کھل کر اپنے شاگرد کا ساتھ دیا ہوگا یا کم از کم تاویلات سے کام لے کر بالواسطہ ان کی تائید کی ہوگی۔اس کے برخلاف علائی نے جو عزیز کی کج طبعی اور کج بحثی سے بہ خوبی واقف تھے، صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ظہیر کی حمایت کی ہوگی۔عزیز کو اپنے خواجہ تاش کا یہ طرزِ عمل یقیناً شاق گزرا ہوگا۔ممکن ہے کہ انہوں نے حسبِ عادت ادھر ادھر ان کے خلاف دو چار جملے بھی کہہ دیے ہوں، جن کا ردِ عمل اس برہمی کی صورت میں ظاہر ہوا ہو جس کی طرف غالب نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔

علائی کے نام غالب کے اس خط کے تمام مندرجات کا مصداق صرف یوسف علی

خاں عزیؔز کی ذات ہے ،اس خیال کی تائید کا ایک اور قرینہ بھی موجود ہے ۔ غالبؔ نے ''بنارسی کی دوستی'' کے اس قضیے کی ابتدا ان جملوں سے کی ہے:

''ضمناً ذکر ایک مُدْبِر کا کیا جاتا ہے ۔ جو تم نے اس مُدْبِر کے صفات لکھے ہیں ،سب سچ ہیں ۔''

ان جملوں میں لفظ ''مُدْبِر (بہ سکونِ دال کسرِ مُدْبِر با) دوبار آیا ہے ۔ پڑھنے والے اسے عام طور پر ''مُدَبِّر'' (بہ فتحِ دال وتشدید بائے مکسور) پڑھتے ہیں اور یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ اس کا اشارہ کس شخص کی طرف ہے ۔ چنانچہ قاضی عبدالودود نے بھی ۱۹۶۹ء کے خطبۂ افتتاحیہ کے علاوہ ایک اور تحریر میں جہاں اس خط کے حوالے سے اپنے اس قول کا اعادہ کیا ہے کہ ''معلوم نہیں کہ بنارسی کون ہے اور اس کے ساتھ علائؔی کے کیا معاملات تھے'' ،وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ''مدبر کے متعلق (اس خط میں) جو کچھ ہے ،بنارسی سے یا کسی اور شخص سے اس کا تعلق ہے ،میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا ۔'' واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ حتمی طور پر مُدَبِّر (بہ فتحِ دال وتشدید بائے مکسور) نہیں ،مُدْبِر (بہ سکونِ دال کسرِ با) ہے اور یہ اس شخص کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کا مفصل ذکر آئندہ سطور میں آیا ہے ۔لغت کے مطابق مُدْبِر اُس شخص کو کہتے ہیں جسے اقبال مندی پیٹھ دکھا چکی ہو ،یعنی جو شخص جاہ وثروت اور عیش وآسائش کے دن دیکھنے کے بعد افلاس وتنگ دستی کی زندگی گزار رہا ہو ۔گذشتہ سطور میں غالبؔ کے خطوط کے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ،ان سے جہاں عزیؔز کی مفلوک الحالی کا اندازہ ہوتا ہے ،وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ''عالی خاندان اور ناز پروردہ آدمی'' تھے ۔مثنوی ''حقیقت حال'' میں خود عزیؔز نے ''شکایت از سپہرِ بے مہر'' کے زیرِ عنوان اپنی اس برگشتہ طالعی پر اس طرح خون کے آنسو بہائے ہیں:

کیوں فلک ! جس کا جد ہو صوبے دار　　وہ پھرے تیرے دور میں ناچار
کیوں فلک ! جس کے جد کو ہو جاگیر　　ہو وہ زندانِ حزن وغم میں اسیر
کیوں فلک ! جس کا جد عطا کرے راج　　ہو وہ نانِ شبینہ کو محتاج
کیوں فلک ! جو کہ خاندانی ہو　　اس پہ خلقت کی ظلم رانی ہو
کیوں فلک ! جو رہا ہو خود حاکم　　ظلم اس پر روا رکھیں ظالم

کیوں فلک! عقلِ کل پڑھائے جسے   خلق ''خود سر معلّم'' اس کو کہے

''غالبؔ نے ایک لفظ کے پردے میں اجمالاً کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے، ان اشعار میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ ایک اور ثبوت ہے اس بات کا کہ اس خط میں عزیز کے علاوہ کوئی اور شخص غالب کا مشارٌ الیہ نہیں۔

غالبؔ کے زیرِ بحث خط پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اسے مجملاً ۲۸/جولائی ۱۸۶۵ء کے بعد کی تحریر قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس خط میں غالبؔ نے ''کمیٹی'' کا ذکر کیا ہے اور اس سے غالباً دہلی سوسائٹی مراد ہے جس کا پہلا جلسہ ۲۸/جولائی ۱۸۶۵ء کو ہوا تھا۔[۱۱] اس سلسلے میں غالب کا اپنا بیان حسبِ ذیل ہے:

> ''مدّعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ اگر کل کمیٹی میں گئے ہو تو میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو۔''

کمیٹی میں علائیؔ کی شرکت اور غالبؔ کا سوال پڑھے جانے کے پس منظر میں سوسائٹی کی مختلف کارروائیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ استفسار ۲۱/جولائی ۱۸۶۸ء کے جلسے سے متعلق ہے اور یہ خط اس کے دوسرے دن یعنی ۲۲ جولائی ۱۸۶۸ء کو لکھا گیا تھا۔ اس جلسے کی روداد میں کہا گیا ہے کہ

> ''سکریٹری نے روبکار محکمۂ ڈائرکٹری مورخہ ۱۷/اپریل در بابِ رائے کتاب ''**مَفرَغَةُ العَمَلَه**'' اور کیفیتِ جناب مرزا نوشہ صاحب و نواب علاء الدین احمد خاں صاحب پڑھ کر سنائی۔ جناب مرزا صاحب کی رائے کو سب نے پسند کیا اور جملہ ممبروں کی رائے سے طے ہوا کہ ممبرانِ سوسائٹی میں سے جو صاحب اور اپنی رائے اس باب میں لکھیں، وہ اور نیز یہ جواب پڑھی گئی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بعدِ ترمیم مرسل ہوں۔''[۱۲]

غالبؔ نے اپنے خط میں جس سوال کے پڑھے جانے کے متعلق دریافت کیا ہے، اس سے بہ ظاہر کتاب ''**مَفرَغَةُ العَمَلَه**'' کے بارے میں ان کی تحریر کردہ یہی

''کیفیت'' یا ''رائے'' مراد ہے، جو ۲۱ر جولائی ۱۸۶۸ء کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ خیال رہے کہ برطانوی دور میں ہر اس تحریر کو جو کسی حاکم کے حضور میں پیش کی جاتی تھی، ''سوال'' کہا جاتا تھا۔ یہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ ۲۸ر جولائی ۱۸۶۵ء کو سوسائٹی کی تاسیس کے بعد اس کا پہلا باقاعدہ جلسہ ۱۱ر اگست ۱۸۶۵ء کو ہوا تھا۔ غالبؔ نے اس جلسے میں شرکت کی تھی اور ایک مضمون بھی پڑھا تھا، لیکن اسی جلسے کے دوران انہوں نے اپنی ضعیف العمری اور ناتوانی کا عذر پیش کر کے اس وعدے کے ساتھ آئندہ جلسوں میں شرکت سے معذرت کر لی تھی کہ ''اگر کسی امر میں بہ ذریعہ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے۔'' [۱۲] اس کے بعد سوسائٹی کے صرف تین جلسوں کی روداد میں ان کا نام آیا ہے۔ ۲۱ر جولائی ۱۸۶۸ء کے مذکورۂ بالا جلسے کے علاوہ باقی دو جلسے ۲۲ر اکتوبر ۱۸۶۷ء اور ۱۲ر مارچ ۱۸۶۹ء کو منعقد ہوئے تھے۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۸۶۷ء کے جلسے میں ''سبد چیں'' کی چھے جلدیں سوسائٹی کو پیش کرنے پر ان کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور ۱۲ر مارچ ۱۸۶۹ء کو انجمنِ تہذیب، لکھنؤ کی طرف سے موصول شدہ خط ''در بابِ تعزیتِ مرزا نوشہ صاحب مرحوم'' ان کے فرزندِ متبنّیٰ مرزا حسین علی خاں کے روبرو جلسۂ عام میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

''قصۂ ممتاز'' سے متعلق یہ معاوضہ ۲۱ر جولائی ۱۸۶۸ء سے کچھ ہی دن پہلے کا واقعہ ہے، اس کی تائید مثنوی ''حقیقتِ حال'' کے بعض بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے ایک بیت کے مطابق عزیزؔ ''آٹھویں جنوری کی، سن سٹسٹھ'' کے بعد کرولی گئے تھے اور ۱۸ر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۳ر اپریل ۱۸۶۷ء کو مثنوی کی تکمیل سے قبل وہاں سے دہلی واپس آچکے تھے۔ کرولی کے اس قیام کے زمانے میں وہ برابر اس قصّے کی تصحیح واصلاح کے کام میں مصروف رہے تھے اور وہاں سے واپس آتے وقت لالہ بندا مل عطّار کے نام حکیم احسن اللہ خاں کا خط اپنے ساتھ لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ بندا مل کے زیرِ اہتمام اس کی کتابت وطباعت کا کام اس کے بعد ہی شروع ہوا ہوگا۔

ان قرائن وشواہد کی روشنی میں جو باتیں شکوک وشبہات سے ماورا یا تقریباً طے شدہ معلوم ہوتی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) قصہ ممتاز کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۸۶۷ء اور جولائی ۱۸۶۸ء کے درمیان کسی وقت شائع ہوا تھا۔

(۲) اس قصے کی تصحیح اغلاط اور اصلاحِ زبان کا کام مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ بنارسی نے انجام دیا تھا، جس پر اس کے مترجم ظہیرؔ دہلوی کو سخت اعتراضات تھے اور انہوں نے ایک محضر کے ذریعے دہلی کے مشاہیر اہلِ علم سے اس باب میں ان کی رائیں بھی طلب کی تھیں۔

(۳) علائیؔ کے نام کے جس خط میں بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھانے کا ذکر آیا ہے، وہ ۲۲ر جولائی ۱۸۶۸ء کو لکھا گیا تھا۔ حالات وواقعات کی اس ترتیب اور تسلسل کے پیشِ نظر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ غالبؔ کے متذکرہ خط میں ''بنارسی'' سے مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ کے علاوہ اور کوئی شخص مراد نہیں۔ غالبؔ کے شاگردوں اور دوستوں میں وہی تنہا ایسے شخص تھے جو بنارس وطنی نسبت رکھتے تھے اور جن کے ساتھ غالبؔ کا غیر معمولی تعلقِ خاطر ان کی مختلف تحریروں سے ظاہر ہے۔

حواشی:

۱۔ مقالاتِ بین الاقوامی غالب سمینار، مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، شائع کردہ یادگارِ غالب کمیٹی، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۷

۲۔ ماہ نامہ شب خون، الہ آباد، شمارہ نمبر ۲۲۰، اکتوبر ۱۹۹۸ء ص ۱۵

۳۔ ایضاً، ماہ نامہ شب خون، الہ آباد، شمارہ نمبر ۲۲۶، مئی جون ۱۹۹۹ء، ص ۴۷

۴۔ غالبؔ کے خطوط، جلدِ اول، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، شائع کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۴

۵۔ سخنِ شعرا، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۳۲۹

۶۔ وے خم خانۂ جاوید، جلد پنجم، مرتبہ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۵۷۷

۸۔ قصۂ ممتاز وقصۂ ممتاز باتصویر، میور پریس، دہلی، ص ۳و۴

۹۔ مثنوی ''حقیقت حال'' کا واحد قلمی نسخہ رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے۔ یہ خود عزیزؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

۱۰ جہانِ غالبؔ، از قاضی عبدالودود، شائع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۸

۱۱ غالبؔ کے خطوط، جلدِ اول، ص ۴۸۱

۱۲ احوالِ غالب، مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد، شائع کردہ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۰

۱۳ ایضاً، احوالِ غالبؔ، ص ۱۷۴

اسلم پرویز

غالبؔ، اور غالبؔ اور بنارس

غالبؔ محض ایک فرد نہیں بلکہ اصل میں وہ تھے جس کے لیے انگریزی زبان میں نہایت ہی موزوں اور متناسب لفظ phenomenon ہے۔لفظ phenomenon کے معنی مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو ڈکشنری میں ملتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں: مظہر، مظہرِ قدرت یا فطرت، مُدرِک بالحواس یا بالنفس، عجیب و غریب، انوکھی چیز یا شخص یا واقعہ۔ غالبؔ انوکھی چیز نہ سہی لیکن وہ ایک انوکھا شخص یا واقعہ ضرور تھے۔انوکھے واقعے ایسے ہی رونما نہیں ہو جاتے۔وہ Eventually یا Really یعنی فی الواقع یا واقعتاً رونما ہوتے ہیں۔واقعہ کوئی بھی ہو سکتا ہے لیکن انوکھا وہی واقعہ ہوتا ہے کہ جس میں واقعہ ہونے کے ساتھ ساتھ بھرپور واقعیت بھی ہو، اس کی اپنی مخصوص واقعیت۔اسی واقعیت کا دوسرا نام شاید phenomenon ہے جو غالبؔ تھے۔ایسی انوکھی شخصیت کبھی کبھی کسی عہد کے پورے منظرنامے میں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔غالبؔ کا معاملہ بھی ہندستان اوران کی تخلیقی شخصیت کی حد تک لگ بھگ یہی تھا اور اس کا سبب ہے کہ ایسی شخصیتیں odd man out کے مصداق فردِامروز سے زیادہ فردِفردا ہوتی ہیں۔فردا کا قیاس اگر ہر شخص کر سکتا تو پھر فردا

کے اُس 'گلشنِ نا آفریدہ' کی ڈالیں اتنے بے شمار عندلیبوں سے لدی ہوتیں کہ زمانے سے فرداودی کی تخصیص ہی مٹ چکی ہوتی۔

خیر تو لفظ phenomenon کی طرف واپس آتے ہوئے ہم اس لفظ کے آخری اور ایک اور معنی کی طرف آتے ہیں یعنی وہ شے جس کا حواس اور دماغ بلاواسطہ ادراک کر سکیں۔ phenomenon کے یہی معنی گویا غالبؔ فہمی کی شرط ہیں۔ یعنی غالبؔ کے ساتھ معانقے کی شرط یہ ہے کہ آپ اُس احساس وذہن کے مالک ہوں جس کی مدد سے آپ براہِ راست غالب تک رسائی حاصل کر سکیں۔ غالبؔ فہمی تک پہنچنے کا ایک سیدھا سادہ نصابی طریقہ تو وہ ہے جو مکتب کے راستے سے ہو کر جاتا ہے اور جس پر پیر رومی نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا تھا: ''شعرامرا بہ مدرسہ کے برد۔'' غالب تک چوں کہ یہ پہنچ براہِ راست نہیں اس لیے اس میں حواس ودماغ کے استعمال کی، اگر وہ آپ کے پاس ہے بھی تو، چنداں ضرورت نہیں۔ پھر اس طریقۂ کار میں غالبؔ کی کوئی نئی جہت، خواہ وہ غالب جہت ہو یا قاری اساس انفرادی جہت، دریافت کرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ غالبؔ جیسا بڑا شاعر اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے احساس وادراک، اپنے فکر وخیال کا ایک جہان تعمیر کرتا ہے۔ اسی ایک جہان کے گرد معروضی اور اضافی نوعیت کے ایسے بے شمار جہان اور تعمیر ہوتے رہتے ہیں جن کی دید ودریافت میں غالبؔ شناسی کے جویا اپنا سر کھپاتے ہوئے براہِ راست غالب تک پہنچنے کا جتن کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے میں گتھم گتھا غالبؔ اور تفہیمِ غالبؔ کی کاوشوں کا یہ چکر دیو کسی قیمتی ہیرے سے پھوٹنے والی ان آڑی ترچھی شعاعوں کے ایسے نمونے اور نقش ونگار سجاتا ہوا چلتا ہے جنہیں دیکھ کر ایک بار تو خود غالبؔ کی آنکھیں بھی خیرہ ہو جائیں۔

غالبؔ کی زندگی میں اتنے بکھیڑے تھے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ پیدائش سے موت تک ان کی پوری زندگی ہی ایک بڑی مہم تھی۔ اس اعتبار سے حال ہی میں شائع ہونے والی خلیق انجم کی کتاب 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'، ایک ایسا مستند، موثر، دل چسپ اور کہیں کہیں دل خراش بھی، رپورتاژ ہے جسے بجا طور پر غالبؔ کی مکمل داستانِ حیات کا خلاصہ یا Epitome کہا جا سکتا ہے۔ Epitome کی تشریح انگریزی ڈکشنری میں یوں بھی

کی گئی ہے۔ A part which represents typically a whole۔غالب افلاس زدہ تھے، عارضوں کا شکار رہتے تھے، اپنی انا کے عناں گیر تھے، بزعم خود اپنے ریختے پر فارسی سے اور اپنی فارسی پر ریختے سے زیادہ قدرت رکھتے تھے، ادبی معرکہ آرائیوں میں گھرے رہتے تھے، ان کی گردن پر ہمیشہ قرض کی تلوار لٹکی رہتی تھی، پنشن کے مسائل ان کے جی کا جنجال تھے، وہ اہلِ کرم کے آگے سوالی اور ننگے بھوکوں کے والی تھے، وہ فریفتۂ مذہب بھی تھے اور وارفتۂ مذہب بھی، وہ شراب پیتے تھے، کبھی کبھی نشاط انگیزی کی خاطر روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں اور کبھی دنیا کے غم غلط کرنے کو ایک گونہ بیخودی کے دامن میں پناہ لینے کو، ان کو دنیا میں اچھوں سے بھی واسطہ پڑا تھا اور بروں سے بھی، ان کی شاعری میں نغمہ ہائے غم بھی تھے اور فلسفیانہ موشگافیاں بھی اور کہیں کہیں کیف و انبساط کی دھنیں بھی، وہ ایک سانس میں دنیا و دیں کو دردِ تہ جامِ ساغر غفلت قرار دیتے ہیں تو دوسرے ہی میں اپنے خامۂ ہذیاں تحریر کو حرفِ لاحول لکھنے کی تاکید کرتے ہیں، وہ ایک طرف خلا کی پہنائیوں میں سفر کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف دنیا کی آلائشوں کی دلدل میں گلے گلے دھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔غرض ان کی زندگی کا یہ تمام سروسامان ایک کیپ سول کی شکل میں ان کے دلّی سے کلکتہ کے سفر میں بھی ان کے ساتھ تھا۔

بنارس لگ بھگ دلّی اور کلکتہ کے بیچ واقع ہے۔صحرانوردوں کی راہ میں کبھی کبھی نخلستان بھی آجاتے ہیں۔دلّی سے بنارس تک کے سفر کے دوران غالب مالی پریشانیوں کا شکار رہے، جس سے مل سکا انہوں نے قرض بھی لیا، سفر کی صعوبتیں جھیلیں، انسانی رشتوں کے اُتار چڑھاؤ کے جھکولے کھائے جن میں ایک بڑا جھکولا الہٰ آباد تھا۔لیکن بنارس کی پُر کیف فضا، اس کا رومانی ماحول اور روح پرور نظارے ان سب نے ایک بارگی غالب کا دل موہ لیا۔بنارس پہنچ کر سفرِ کلکتہ کا ایک پہاڑ سر ہو چکا تھا اور دوسرا پہاڑ سر ہونے کو سامنے کھڑا تھا۔بنارس گویا ان کے لیے دم لے کر آگے چلنے کے لیے ماندگی کا وقفہ تھا۔بنارس پہنچ کر پچھلے سفر کی ساری کلفتیں بھلا کر اور کلکتہ کے بقیہ سفر سے کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند کر وہ ایک عالمِ انبساط میں پہنچ گئے اور ان پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جیسی ان کی غزل کے اس شعر میں:

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

یہ فراری لمحات جو اُن پر قیامِ بنارس کے دوران گزرے ان کی زندگی میں کوئی پہلی بار نہیں آئے تھے۔ یہ لمحات تو وہ خود پر گاہے گاہے طاری کرتے رہتے تھے اور یہ ایک نوع کی آوردہ کیفیت تھی ان کی ذات کی اس دائمی، خلقی کیفیت سے یکسر مختلف جس کا اظہار مثلاً ان کے ان اشعار میں ہوتا ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

تو بنارس جس طرح اس قلیل مدت کے سفرِ کلکتہ کے صحرائے لق ودق میں ایک نخلستان کی طرح در آتا ہے ان کے زیاں خانۂ حیات میں اس طرح چھوٹے چھوٹے نخلستانوں کی شہادت ان کے بعض خطوط اور اشعار دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو اُن کے سفرِ حیات کے خلقی نہیں 'ناسخی قسم' کے پڑاؤ ہیں جہاں سوزش طلبی کے بیان میں بھی ایک چٹخارہ ہوتا ہے بقولِ ناسخ:

دل ہمارا اس قدر سوزش طلب پروانہ ہے
شمع سے بھاگے جو اس میں میل ہو کافور کا

غالب کے تعلق سے سوزش طلبی کے اس بیان کی خلقی اور پُر اثر صورت ان کا یہ شعر ہے:

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ اس گفتگو کا مقصد آورد کی تنقیص ہرگز نہیں اس لیے کہ ایک ارفع شعر کی تکمیل میں آمد کے رنگ میں شاعر کا تخلیقی جوہر یعنی Creative genius اور آورد کے روپ میں اس کی صناعی یعنی Craftmanship دونوں کا برابر کا دخل ہوتا ہے اور شاعر کے انتہائے کمال کو پہنچنے کے بعد

یہ سب کچھ یعنی امتزاجِ آمد و آورد بے ساختہ طور پر خود بخود بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد ایک بار پھر لوٹتے ہیں نخلستانِ بنارس کی طرف۔ تو بنارس کے بارے میں غالب نے نثر یا شعر کی زبان میں جو کچھ کہا ہے وہ غالب کی اس فراریت پسند نفسیات کا زائیدہ ہے جہاں وہ زندگی کے ادبار کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے کاندھوں سے جھٹک دینا چاہتے ہیں اور جیسا کہ کہا گیا یہ معاملہ کچھ بنارس ہی سے مخصوص نہیں۔ زندگی میں وقفے وقفے سے بنارس سے پہلے اور اس کے بعد بھی وہ ایسا کرتے رہے ہیں۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بنارس کے سناریو (Scenario) نے اس کیف و انبساط کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ غزل کا انداز تجریدی ہوتا ہے اور مثنوی کا بیانیہ۔ نشاط و انبساط کے تعلق سے بھی غزل کا شعر پہلے ذہن کو کھٹکھٹاتا ہے جب کہ مثنوی کا شعر سیدھے سیدھے حواس کو برانگیختہ کرتا ہے۔ یوں بھی غزل کے انبساطی اشعار ان کے دیوان میں ریزہ ریزہ بکھرے پڑے ہیں جب کے مثنوی 'چراغ دیر' کا متسلسل بیانیہ ایک ہی وار میں پڑھنے والے پر پٹیالی پیگ کا سا نشہ طاری کر دیتا ہے۔ یعنی غالب کی غزلوں کے تمام انبساطی اشعار تو آپ ایک ہی گھونٹ میں نہیں چڑھا سکتے لیکن چراغِ دیر کو سارا کا سارا آپ بآسانی گلپ کر سکتے ہیں اور حنیف نقوی کا اس مثنوی کا انتہائی رواں دواں اردو ترجمہ تو کم فارسی جاننے والے اردو کے قاریوں کے لیے مثنوی کو اور بھی آسان بنا دیتا ہے۔ غالب کی غزل کے فارسی شعر کی تمام صوری اور معنوی باریکیوں کا پورا لطف اٹھانے کے لیے اسے براہِ راست فارسی ہی میں پڑھ کر سمجھنا زیادہ لطف دیتا ہے خواہ اس کے لیے آپ فارسی کی خلیج پار کرنے کے لیے کتنی ہی مشقت اٹھانی پڑے۔ لیکن 'چراغ دیر' کا سارا کام فارسی کم جاننے کی صورت میں اس کے ترجمے سے، بھی چلایا جا سکتا ہے اور چلایا جاتا رہا ہے۔ اب غالب کے اردو کلام کی طرف آیئے۔ ان کی 'موج شراب' والی غزل کا یہ شعر خاص طور پر ملاحظہ ہو:

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

ایک اور غزل کا یہ شعر دیکھیے:

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

اور رفتار ہی پر غالبؔ کی غزل کا یہ شعر بھی:

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

اب ذرا غالبؔ کی وہ بہاریہ غزل ملاحظہ ہو جو بظاہر تو شاہ کے غسل صحت پر کہی گئی ہے مگر شاہ تو غالبؔ کے ہاتھوں مقطعے کے حجرے ہی میں بند رہ گئے اور غزل کے بقیہ اشعار احساسِ لطیف کی وادی میں رنگ و نکہت کی بارش کرتے رہے۔ ملاحظہ ہوں اس غزل کے یہ تین اشعار:

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

غالبؔ کی غزلوں میں نشاط و طرب کی کیفیات کا بیان ہے وہ ان کے داخلی وجود سے اُبلتا ہوا وہ چشمہ ہے جس کا منبع ان کے تصورات اور احساس کا جہان ہے۔ اس کے برعکس بنارس سے متعلق ان کی فارسی مثنوی ’چراغِ دیر‘ غالبؔ کے مخصوص انداز میں بنارس کے خارجی حسن کا بیان ہے۔ تاہم یہ بات مدنظر رہنی چاہیے کہ بنارس کے دورانِ قیام بھی غالبؔ کی دائمی حزنیہ سائیکی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ سکی تھی اور خود مثنوی ’چراغِ دیر‘ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ بنارس میں غالبؔ اُسی ملی جلی حزنیہ طربیہ کیفیت میں مبتلا رہے جو قدیم یونانی حزنیہ طربیہ ناٹکوں کا خاصہ تھا۔ چناں چہ ’چراغِ دیر‘ کو لیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا آغاز حزنیہ نوٹ کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا اختتام بھی حزنیہ نوٹ ہی پر ہوتا ہے۔ مثنوی کے درمیان تازہ دم ہونے کے لیے وہ بنارس کے خارجی حسن کے ساتھ ہم آمیز ہوتے ہیں لیکن مادّی نوعیت کے عشق کی طرح یہ جادۂ طرب دیرپا ثابت ہونے کے بجائے جلد ہی طے ہو گیا اور مثنوی پھر اپنے اسی حزنیہ نوٹ پر واپس آ کر، جس سے اس کا آغاز ہوا تھا، اختتام پذیر

ہوئی۔

جیسا کہ کہا گیا اس مثنوی کے تین پڑاؤ ہیں...... پہلا حزنیہ، دوسرا طربیہ، تیسرا پھر حزنیہ ان میں سے ہر پڑاؤ کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پہلا پڑاؤ (حزنیہ):

نَفَس باصور دم سازست امروز
خموشی محشرِ راز ست امروز
رگِ سنگم شرارے می نویسم
کفِ خاکِ غُبارے می نویسم
دل از شورِ شکایت ہا بجوشت
حبابِ بے نوا طوفاں خروشت
شکایت گونہٗ دارم ز احباب
کتانِ خویش می شویم بہ مہتاب
جہاں آباد گر نبود الم نیست
جہاں آباد بادا، جائے کم نیست
بخاطر دارم اینک گل زمینے
بہار آئیں، سوادِ دل نشینے

دوسرا پڑاؤ (طربیہ):

تعالی اللہ بنارس چشمِ بددور
بہشتِ خرم و فردوسِ معمور
بیا اے غافل از کیفیتِ ناز
نگاہے بر پری زادانش انداز
کفِ ہر خاکش از مستی کنشتے
سرِ ہر خارش از سبزی بہشتے
سوادش پائے تختِ بت پرستاں

سراپایش زیارت گاہِ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیانست
ہمانا کعبۂ ہندوستانست
بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور
سراپا نورِ ایزد چشمِ بددور
میانہا نازک و دلہا توانا
ز نادانی بہ کارِ خویش دانا
بہ لطف از موجِ گوہر نرم روتر
بناز از خونِ عاشق گرم رو تر
زرنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش
بہارِ بستر و نوروزِ آغوش
ز تابِ جلوۂ خویش آتش افروز
بتانِ بت پرست و برہمن سوز
بسامانِ دوعالم گلستاں رنگ
ز تابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
بہ تن سرمایۂ افزائشِ دل
سراپا مژدۂ آسایشِ دل
بہ چیں نبود نگارستاں چو اوئی
بہ گیتی نیست شارستاں چوں اوئی
بیاباں در بیاباں لالہ زارش
گلستاں در گلستاں نوبہارش

تیسرا پڑاؤ (حزنیہ):

شبے پُر سیدم از روشن بیانے
زگردش ہائے گردوں راز دانے

ز ایماں ہا بجز نامے نماندہ
بغیر از دانہ ودامے نہ ماندہ
پدرہا تشنۂ خونِ پسرہا
پسرہا دشمن جانِ پدرہا
بدیں بے پردگی ہائے علامت
چرا پیدہ نمی گردد قیامت
بنفخ صورتعویق ازپے چیست
قیامت راعناں گیرِ جنوں کیست
سوئے کاشی باندازِ اشارت
تبسم کرد وگفتا،ایں عمارت
کہ حقا نیست صانع را گوارا
کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را
بلند افتادہ تمکینِ بنارس
بُوَد بر اوجِ او اندیشہ نارس
الا اے غالبِ کار اوفتادہ
زچشمِ یارو اغیار اوفتادہ
ز خویش وآشنا بیگانہ گشتہ
جنوں گل کردہ و دیوانہ گشتہ
چہ جوئی جلوہ زیں رنگیں چمن ہا
بہشت خویش شواز خوں شدن ہا

مثنوی 'چراغ دیر' کا تمام تر شعری حسن اپنی جگہ مگر جب سارا معاملہ حقیقی واردات پر مبنی ہوتو شعر کے تخیلاتی، مجرد اور ماورائی اسلوب کے مقابلے نثر کا اظہار کے مسائل سے نسبتاً آزاد دوٹوک بیان ہی شاید زیادہ موثر اور کارگر ثابت ہوتا ہے۔ ہاں ایسے موقعوں پر بات کو قابلِ مطالعہ بنانے کے لیے تخلیقی جوہر کے استعمال کی ضرورت شاعر کی طرح نثر نگار کو بھی

پیش آتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انشائیہ، خودنوشت، فکشن اور بعض صورتوں میں مکتوب بھی شاعری کے مقابلے پر تو نہیں بلکہ اس کے متوازی آکر کھڑے ہو جاتے۔ اور پھر یہ فیصلہ اپنے آپ ہو جاتا ہے کہ آیا یہ دراصل شاعری کا محل تھا یا نثر کا۔ مثنوی 'چراغِ دیر' شاعری کی موسیقی پر گایا ہوا گویا بنارس کا لفظ سے آزاد شبد مکت وہ پکا راگ ہے، جس پر شعر کی موسیقی کے باذوق قاری بجا طور پر سر دھن سکتے ہیں اور دھنتے آئے ہیں لیکن فی الحقیقت غالبؔ کے وجود کے اندر سرایت کر جانے والا بنارس کیا ہے اس کا صحیح جلوہ تو غالبؔ کے نامہ ہائے فارسی (اردو ترجمہ) کے اِن دو اقتباسات ہی سے لگایا جا سکتا ہے جنہیں ہم یہاں خلیق انجم کی کتاب 'غالبؔ کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' کے صفحات ۵۰ اور ۵۱ کے حوالے سے پیش کرتے ہیں:

> ''بنارس کی ہوا کے اعجاز نے میرے غبارِ وجود کو علمِ فتح کی طرح بلند کر دیا اور وجد کرتی ہوئی نسیم کے جھونکوں نے میرے ضعف اور کمزوری کو بالکل دور کر دیا، مرحبا! اگر بنارس کو اس کی دل کشی اور دل نشینی کی وجہ سے میں سویدائے عالم کہوں تو بجا ہے۔ مرحبا! اس شہر کے چاروں طرف سبزہ و گل کی ایسی کثرت ہے کہ اگر اسے زمین پر بہشت سمجھوں تو روا ہے۔ اس کی ہوا کو یہ خدمت سونپی گئی ہے کہ وہ مردہ جسموں میں روح پھونک دے۔ اس کی خاک کا ہر ذرّہ راہرو کے پاؤں سے پیکانِ خار باہر کھینچ لے۔ اگر گنگا اس کے پاؤں پر اپنا سر نہ رگڑتا تو ہمارے دلوں میں اُس کی اتنی قدر نہ ہوتی۔ بہتا ہوا دریائے گنگا اُس سمندر کی طرح ہے، جس میں طوفان آیا ہوا ہو۔ یہ دریا آسمان پر رہنے والوں کا گھر ہے۔ سبزہ رنگ پری چہرہ حسینوں کی جلوہ گاہ کے مقابلے میں قدسیانِ ماہ تابی کے گھر کتاں کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اِس شہر کے عمارتوں کی کثرت کا ذکر کروں تو وہ سراسر مستوں سے آباد ہیں

اور اگر اس شہر کے اطرافِ سبزہ وگل کا بیان کروں تو دور دور تک بہارستان نظر آئے۔'' (فارسی سے ترجمہ)

☆

''اس تماشا گاہ میں دل فریبی کا یہ عالم ہے کہ پردیس میں ہونے کا غم دل سے دور ہو گیا ہے۔اس صنم کدے سے جب جب ناقوس کی نشاط آفریں آواز بلند ہوتی ہے تو عجب سرور و کیف کا عالم ہوتا ہے۔بادۂ تماشا سے میرا ذوق اس قدر مخمور ہو گیا ہے کہ دہلی کی یاد بھی دل سے جاتی رہی۔یہ عجیب صورتِ حال درپیش ہے۔اگر دشمنوں کی خندہ زنی کا خوف نہ ہوتا تو میں ترکِ دین کر کے تسبیح توڑ دیتا،قشقہ لگالیتا اور اس وضع کے ساتھ اُس وقت تک گنگا کے کنارے بیٹھا رہتا جب تک کہ آرائشِ ہستی کی گرد نہ ڈھل جاتی اور قطرے کی طرح دریا میں نہ سما جاتا۔

اس ارم آباد میں قدم رکھتے ہی میں نے کوئی علاج کیا نہ کوئی دوا کھائی،پھر بھی نئے امراض کی تشویش بھی دل سے دور ہو گی بلکہ میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اصل مرض میں بھی کچھ افاقہ ہو گیا ہے۔جو دوائیں کھا رہا ہوں،اُس کی وجہ آئندہ کے لیے محض احتیاط ہے،ورنہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے نہ تلافیِ ماضی منظور ہے اور نہ رعایتِ حال۔''

اس طرح مثنوی 'چراغِ دیر' بنارس کا رومان ہے اور درج بالا نثری اقتباس اس کی حقیقت۔بلاشبہ رومان اور حقیقت کی اس آنکھ مچولی کا نظارہ انتہائی دل چسپ اور دل رُبا ہے۔اور یہ دونوں ہی غالب کو ان کے قیامِ بنارس کی دین ہیں۔

شریف حسین قاسمی

ادبیاتِ فارسی میں حدیث بنارس اور غالب کی چراغِ دیر

غالب اپنی پنشن کے سلسلے میں کلکتے جاتے ہوئے الہ آباد سے بنارس آئے تھے۔الہ آباد میں ان کا قیام چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں رہا۔الہ آباد سے وہ اتنے بدحظ ہوئے کہ انہوں نے قسم کھائی کہ اگر واپسی الہ آباد سے گذرنے پر منحصر ہے تو وہ ترک وطن کردیں گے، واپس نہیں جائیں گے۔[1]

وہ بہرحال الہ آباد سے بنارس آگئے اور یہاں پہلے سرائے نیرنگ آباد (معروف بہ نورنگ آباد) اور پھر اس سرائے کے عقب میں میاں رمضان اور مٹھالی کی حویلی میں گوسی خانساماں کی حویلی سے ملحق ایک کرایے کے مکان میں ایک ماہ مقیم رہے۔[2] یہ ایک مبتذل جگہ تھی۔[3] بنارس میں اس طویل قیام کی ایک وجہ غالب کے 'ایک' غارت گرِ ہوش' سے تعلقات بتائی گئی ہے۔[4] وہ اس 'بت کاشی' کو کلکتے میں بھی بھول نہیں سکے تھے۔[5]

غالب نے اپنے قیام بنارس کے دوران ایک سو آٹھ ابیات پر مشتمل ایک مثنوی چراغِ دیر کہی۔اس کی بڑی دھوم ہے، لیکن یہ واحد مثنوی نہیں جس میں بنارس کی تعریف

وتوصیف کی گئی ہے۔فارسی کے متعدد مآخذ میں بنارس کی سماجی و مذہبی اہمیت، یہاں کے قدرتی مناظر، مذہبی ماحول، عبادت خانے، گنگا کے کنارے اشنان کے مناظر، یہاں کا فطری حسن وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مآخذ عہد غالب سے قدیم تر بھی ہیں اور حتی غالب کے بعد بھی فارسی آثار میں بنارس کا ایک مذہبی مرکز کی حیثیت سے ذکر ملتا ہے اور وہ بھی علامہ اقبال کے منظوم آثار میں۔

بنارس کو فارسی زبان وادب کے مرکز ہونے کا شرف حاصل نہیں لیکن یہاں چند فارسی شعرا و ادبا یا مستقل طور پر مقیم رہے یا سفر کے دوران چند روز ٹھہرے اور اپنی راہ لی۔ان میں سے چند ایسے بھی تھے جنہوں نے یہاں کی مذہبی اہمیت اس کے ظاہری حسن عمارات اور یہاں سے گذرنے والے دریائے گنگا کا ذکر اور ان کی اجمالی یا تفصیلی توصیف وتعریف کی ہے۔

فارسی کی بیشتر کتب تاریخ میں بنارس کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ذکر حاکمان وقت کی فوجی کارروائیوں کے ضمن میں آتا ہے۔ان میں بنارس کی سماجی اور ثقافتی زندگی پر کوئی خاص اظہار نہیں کیا گیا۔البیرونی نے کتاب الہند میں بنارس کے بارے میں صرف یہ اطلاع دی ہے کہ محمود غزنوی نے اس شہر پر حملہ نہیں کیا لیکن جن علاقوں سے محمود کا گزر ہوا وہاں کے حاکم یہاں روپوش ہو گئے تھے اس کے علاوہ ہندو علما بھی محمود کے حملوں کی وجہ سے کشمیر اور بنارس منتقل ہو گئے۔[٦] اس طرح ظاہر ہے بنارس ہندو علوم کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔تاریخ فیروز شاہی تالیف شمس سراج عفیف میں فوجی کارروائیوں کے ضمن میں بنارس کا ذکر کیا گیا ہے اور خود شہر بنارس کا مختصر ذکر بھی ہے۔[٧] بابر نے بنارس اور غازی پور کے درمیان گنگا پر دور سے دیکھا کہ دو غلام عورتوں اور چار فوجیوں کو مگرمچھ نے نگل لیا تھا۔ بابر قلعۂ بنارس کا ذکر بھی کرتا ہے۔[٨]

سجان رائے کی **خلاصۃ التواریخ** میں بنارس کا نسبتاً تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔اس کے بقول:

بنارس الہ آباد سے بیس کردہ کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر دو دریاؤں برنہ اور اسی کے درمیان واقع ہے اس لیے اس نام سے موسوم ہے، اسے کاشی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قدیم

شہر ہے جو کمان کی صورت میں بسا ہوا ہے اور گنگا زہ کی مانند اس سے گذرتی ہے۔ اس شہر کو مہادیو سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ قدیم پرستش گاہ ہے، علم و فضل کا معدن ہے۔ صاحب فضل برہمن، صاحب حال و قال بید خوان یہاں رہتے ہیں۔ دور دراز اور نزدیک کے ممالک سے برہمن اور برہمن زادے علم حاصل کرنے یا علم کی تکمیل کے لیے یہاں آتے ہیں۔ کچھ وارستہ اور آزادہ لوگ دنیاوی علایق کو ترک کرنے کے بعد، رستگاری عقبی کی نیت سے یہاں سکونت پذیر ہوتے ہیں اور موت کا انتظار کرتے ہیں۔ ستارہ مشتری جب بھی برج اسد میں آتا ہے تو دریا میں ایک پہاڑی نمودار ہوتی ہے۔ ایک ماہ تک لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں، پوجا کرتے ہیں۔ یہ قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے۔[9]

بنارس میں فارسی کے بعض شعرا مقیم رہے۔ انہوں نے دواوین مرتب کیے اور دیگر موضوعات پر آثار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

ابوالعلا متخلص بہ انسان ۱۰۳۷/۱۶۲۷ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ صوفی منش انسان فقر و درویشی کی زندگی گذارتے تھے۔ بنارس میں مقیم تھے۔ ان کے دیوان کا ایک خطی نسخہ موجود ہے جس میں ان کا عرفانی کلام محفوظ ہے۔[10]

آنند گھن متخلص بہ خوش یا خویش اٹھارویں صدی کے ایک فارسی شاعر ہیں۔ بنارس سے ان کے تعلق کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ ان کے تین منظوم و منثور آثار کا علم ہے۔ ایک مثنوی ہے کج کلاہ۔ دو جلدوں میں اس مثنوی کا موضوع عرفان و تصوف ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۲۰۸/۱۷۹۴ اور دوسری ۱۲۰۹/۱۷۹۴ میں مکمل ہوئی۔ اس میں داراشکوہ اور بابا لعل کے باہمی تعلقات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اور بنارس اور دریائے گنگا کا حال بھی ستایش آمیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔[11]

خوش کا ایک فارسی دیوان بھی ہے جو ۱۲۰۵/۱۷۹۱ میں مرتب ہوا تھا۔[12] اس کے علاوہ انہوں نے کاشی کھنڈ کا فارسی میں ترجمہ کیا جس میں بنارس کے مقدس مقامات اور اس شہر کی اساطیری سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ اُن رسم و رواج کا ذکر بھی ہے جو یہاں رائج تھے۔ اسے ترجمۂ کاشی کھنڈ یا بحر النجات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں بیشتر مطالب اسکند پورانا سے ماخوذ ہیں۔ یہ ترجمہ جوناتھن ڈنکن (jonathan Duncan) کو پیش کیا

گیا تھا۔[۱۵]

غلام حسین خان بن ہمت خان نے حاکمان بنارس کی تاریخ راجا منسارام سے راجا چیت سنگھ کے ۱۷۸۱ء میں اقتدار سے محروم ہونے تک اپنی ''تاریخ بنارس' میں لکھی ہے۔ یہ کتاب مصنف کے پوتے نے مرتب کی تھی۔ بلونت نامہ یا تحفۂ تازہ میں بھی راجا منسارام سے ۱۱۹۵/۱۷۸۱ میں چیت سنگھ کی حکومت تک بنارس کے حاکموں کے احوال لکھے گئے ہیں۔[۱۶]

ایک صاحب محمد بقا تھے۔ انہوں نے ۲۳ اپریل سے ۱۸ اکتوبر ۱۷۹۸ تک کانپور سے بنارس کا سفر کیا اور ''احوالِ سفر'' کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھا۔ بقا نے جن مقامات کو دیکھا ان کے احوال بیان کیے ہیں۔ بنارس کی بعض عمارتوں کا حال بھی اس میں شامل ہے۔[۱۷]

باقیای نائینی کا یہ شعر بنارس میں ان کے قیام کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے:

در بنارس باقیا باقی نماند
آن قدح بشکست وآن ساقی نماند

باقیای نائینی فارسی کے وہ شاعر ہیں جن سے مصنف تذکرۂ میخانہ کی ۱۰۲۳ میں اجمیر میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ۱۰۲۸ میں صاحب میخانہ سے پٹنا میں بھی ملے تھے۔ یہ بعد میں بنارس میں مقیم رہے۔ ان کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے:

ہمہ حاصلِ جہان را بہ نشاط، صرف مل کن
بہ کافر و مسلمان بنشین و صلح کل کن[۱۸]

محسن رازی دسویں صدی ہجری کے نصف اوّل کے فارسی شاعر ہیں۔ یہ بنارس میں فوت ہوئے تھے۔[۱۹]

صاحب صبح صادق میرزا محمد صادق، مسیح کاشی سے ۱۰۳۴ھ میں بنارس میں ملے تھے۔ مسیح اپنے دور کے مشہور اطبا اور شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔[۲۰]

ناطقی استرآبادی ایک تاجر کی حیثیت سے اکبر کے دور میں ہندستان آیا تھا۔ وطن لوٹ رہا تھا کہ بنارس میں گنگا کے کنارے فوت ہوگیا اور بنارس ہی میں دفنایا گیا۔[۲۱]

نامی مشہدی نے کشمیر اور دہلی دیکھنے کے بعد، ''خوبان بنارس'' کی زیارت کی۔ بنارس سے یہ شاہجہاں آباد لوٹ آیا اور پھر اکبر آباد میں فوت ہوا[۲۲]۔

پٹنا کے علی ابراہیم خان سے فارسی ادب کا طالب علم خوب واقف ہے۔ جب وارن ہیسٹنگس گورنر جنرل تھے تو یہ بنارس میں چیف مجسٹریٹ تھے۔ انہوں نے درج ذیل متعدد علمی و ادبی آثار یادگار چھوڑے ہیں۔ یہ سب آثار بنارس میں لکھے گئے ہیں۔ ابراہیم کا بنارس میں ۱۲۰۸/۹۴-۱۷ میں انتقال ہوا۔[۲۳]

۱۔ خلاصۃ الکلام یہ دو جلدوں میں فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جو ۱۱۹۸/۸۴-۱۷ میں مکمل ہوا۔ اس میں مثنویات سے نمونہ کلام انتخاب کیا گیا ہے۔ مصنف نے مقدمے میں لکھا ہے کہ وہ شاہ عالم (۱۱۷۸-۱۲۲۱/۱۷۵۰-۱۸۰۶) کے تیرہویں سال جلوس سے یہ تذکرہ لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے[۲۴]۔

۲۔ تاریخ ابراہیم خان کا ایلیٹ نے بھی ذکر کیا ہے۔ ایلیٹ نے اسے اہم تاریخ قرار دیا ہے۔ مصنف کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ وشواس راؤ کی ان کوششوں کا پردہ فاش کرے جو اس نے مغل تخت ہتیانے کے لیے کی تھیں۔[۲۵]

۳۔ گلزار ابراہیم فارسی میں ریختہ کے شعرا کا تذکرہ جو شاہ عالم کے زمانے میں ۱۱۹۸/۸۴-۱۷ میں مکمل ہوا۔[۲۶]

۴۔ صحف ابراہیم بھی قدیم و جدید شعرا کا تذکرہ ہے اور شاہ عالم کے دور حکومت ہی میں ۱۲۰۵/۹۰-۱۷ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۵۔ تاریخ چیت سنگھ' میں مصنف نے اس راجا کی بغاوت کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ یہ ۱۱۹۵/۸۱-۱۷ میں مکمل ہوئی تھی۔[۲۸]

۶۔ مصنف کے رقعات کے خطی نسخوں کا بھی بعض مآخذ سے علم ہوتا ہے۔[۲۹]

شاہجہاں کے دور حکومت میں ایک اہم کتاب دبستانِ مذاہب لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف میرزا ذوالفقار آذر ساسانی متخلص بہ موبد نے دنیا کے بڑے مذاہب کی سرگذشت لکھی ہے۔ ظاہر ہے اس میں ہندو مذہب کا بھی تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ موبد نے اس کتاب میں بنارس کے بعض ایسے غیر معمولی علمی و روحانی صلاحیتوں کے برہمنوں

کا ذکر کیا ہے، جن کے بارے میں کسی دوسرے مآخذ سے پتا نہیں چلتا۔ ایسے ہی پنڈتوں میں ایک چتر دیہ بھی تھا۔ جہانگیر اس کا معتقد تھا اور کما حقہ، اس کی دلداری کرتا تھا۔ عبدالرحیم خان خانان اس کے سامنے سجدہ کرتا تھا۔ دبستانِ مذاہب کے مصنف نے اسے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اور چتر دیہ نے اپنے ایک شاگرد گنیش من کو ہدایت کی تھی کہ وہ موبد کے بالغ ہونے تک اس کے ساتھ رہے۔[۳۱] چتر دیہ کا ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں بنارس ہی میں انتقال ہوا۔[۳۲]

موبد بنارس کے ایک دوسرے برہمن کسائی تیواری کا ذکر بھی کرتا ہے جو اپنے علوم میں ماہر تھا۔ یہ لاہور میں دریائے راوی کے کنارے باغِ کامران کے نزدیک مقیم تھا۔ بارش اور دھوپ میں وہ کسی سایے کی تلاش نہیں کرتا تھا۔ کھانے سے پرہیز کرتا تھا۔ البتہ تھوڑا سا دودھ پی لیتا تھا۔ چند مہینوں میں جو رقم جمع ہو جاتی، اسے پارسا برہمنوں کو کھانا کھلانے میں صرف کر دیتا تھا۔[۳۳] بنارس ہی کا ایک ذی علم برہمن رام بھٹ تھا۔ اس نے اپنے مذہب کے طور طریقے چھوڑ کر بہرام کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس کی زبان سے اکثر غیب کی خبریں سنی جاتی تھیں ایک شخص محمد یعقوب بیمار ہوا۔ اطبا نے اس کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے متعلقین بدرجۂ مجبوری ایک عورت کے مشورے پر اس کا معالجہ کرانے لگے۔ یہ عورت اپنے آپ کو عقل مند سمجھتی تھی۔ ایک روز موبد ہشیار رام بھٹ کے پاس گیا۔ دیکھا وہ سر زانو پر جھکائے بیٹھا ہے۔ موبد کے دل میں خیال گذرا کہ اگر بھٹ برگزیدہ لوگوں میں سے ہے تو ضرور بتادے گا کہ یعقوب زندہ رہے گا یا گذر جائے گا۔ اس نے سر اٹھایا اور موبد کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ پوشیدہ راز تو صرف خدا ہی جانتا ہے، لیکن محمد یعقوب مرے گا نہیں۔ ایسا ہی ہوا۔[۳۴]

شاہجہاں کے لڑکے دارا شکوہ نے ۵۰ اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس نے اس کام میں الہ آباد اور بنارس کے صاحبان علم کی مدد کا اعتراف کیا ہے۔ اور الہ آباد کے ساتھ ساتھ بنارس کو ہندو علوم کا ایک اہم مرکز قرار دیا ہے۔ شاہجہاں کے زمانے میں ملاّ طغرا مشہدی دوبارہ ہندوستان آئے اور شاہزادہ مراد کے منشی رہے۔ ان کا انتقال ۱۰۷۸ھ/۸۔۱۶۶۷ء میں ہوا۔ یہ کلیم کاشانی کی قبر کے پہلو میں کشمیر میں دفن ہیں۔ انہوں نے

ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر کی۔ بنارس بھی آئے۔[۵] شوہ گنگا کی تعریف کرتے ہیں: صف آرای باغ است گنگ بنارس ارم چون کند طرح جنگ بنارس

طغرا بنارس کے سبز رنگ حسینوں کا بھی ستایش آمیز انداز میں ذکر کرتے ہیں:

جعفری گردیدہ از سبز بنارس منفعل

زرد رویی راچسان ازشاخ ہستی ردکند

حسن بت راسیر کردم ذوقہا در دیر کردم

نقدایمان خیر کردم پیش دربان بنارس

شاید دہلی میں انہیں ٹھہرنے کا موقع نہیں ملا جو عشوہ خانہ تھا۔ اس لیے بنارس میں قیام ہی کو غنیمت جانا جو کرشمہ زار تھا:

طغرئ بہ عشوہ خانہ دہلی چوں راہ نیست

سیر کرشمہ زار بنارس غنیمت است

بنارس سے ایک عشقیہ داستان کا تعلق ہے۔ اس عشقیہ داستان کو چند شعرا نے اپنے اپنے انداز میں بعض جزئی اختلافات کے ساتھ نظم کیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک سچا واقعہ ہے اور اس دور میں اس کی خاصی شہرت تھی۔ اسی وجہ سے دور اورنگ زیب کے دو شعرا بنیش کشمیری اور معزالدین محمد فطرت موسوی نے نظم کیا اور پھر بعد کے ادوار میں بھی یہ داستان نظم کی جاتی رہی اور میر تقی میر نے بھی اس داستان کو اپنی مثنوی دریائے عشق کا[۶] موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے بعد مصحفی نے بحر المحبت کا موضوع بنایا۔ بنیش نے جو داستان بیان کی ہے اور بعد کی اسی نوعیت کی داستانیں غالباً اسی پر مبنی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے:

> ایک مسلمان نوجوان ایک ہندو دوشیزہ پر عاشق ہو گیا۔ لڑکی حسن و جمال میں یکتا اور نزاکت و شوخی کی تصویر تھی۔ لڑکی روزانہ گنگا کنارے اشنان کرنے آتی تھی۔ نہانے کے بعد ماتھے پر صندل لگاتی تھی۔ محبت دیر تک چھپی نہیں رہی۔ ایک وقت آیا کہ لڑکی بھی جوان کی طرف مایل ہو گئی۔ اشنان کے بہانے دریا پر آتی اور دونوں دیر تک پیار و محبت کی باتیں کرتے، لیکن خوش گذرانی

کا یہ زمانہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ ایک روز دونوں نہاتے وقت بھنور کی لپیٹ میں آ گئے اور غرقِ آب ہو گئے۔ جب ان کے جسد باہر نکالے گئے اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ لڑکی ہندو ہے تو ہندو رسم ورواج کے مطابق اسے جلانا چاہا' لیکن جوان کے حامیوں نے کہا کہ اس کی موت عاشق کی آغوش میں ہوئی ہے' اس لیے مسلمان طریقے پر اسے دفن کیا جانا چاہیے۔ یہ بحث چل رہی تھی کہ زمین شق ہوئی اور عاشق ومعشوق اس میں سما گئے۔ بقول بنیش:

زمین از اشتیاق آن دومدہوش   جو چشم منتظر بکشاد آغوش
در و کردند جا از بی پناہی   چو در دیدہ سفیدی باسیاہی

ان تمام داستانوں میں کسی نہ کسی عنوان سے بنارس اور یہاں کی مذہبی وسماجی کیفیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ بنیش اپنی مثنوی شور خیال میں [۲۷] بنارس کی عشق ومحبت انگیز آب وہوا' برہمن زادوں کا جمال' یہاں کی حسیناؤں کے سبز رنگ وغیرہ کی توصیف میں کہتے ہیں:

بنارس راعجب آب و ہوایی است   برای عشق بازی طرفہ جایی است
برہمن زادگانِ فتنہ آیین   چو گل دارند در برٗجامہ پر چین
بتانش از نمک نیکو سرشتند   کہ موجِ سبز تا باغِ بہشت اند
شدآن روزی کہ ہندستان گلستان   زسبزان شد بنارس سنبلستان

میرزا معز الدین فطرت (متوفی: ۱۱۰۱ھ) [۲۸] نے بھی اپنی مثنوی میں بنارس کی توصیف کی ہے: [۲۹]

دید شہری زنکویان معمور   رشک باغِ ارم وغیرتِ حور
بود دریایی ازان یک طرَ فَش   کہ سزد قرص مہ وخورشید صدقش
ہندوان دجلہ ٔ گنگش خوانند   چوگلابش بہ لباس افشانند

فطرت نے جب گنگا کے کنارے نازنینوں کو نہاتے دیکھا تو اس کی منظر کشی اس طرح کی:

نازنینان به رخ ہمچو مہر ازمیِ حسن برافروختہ چہر
غسل کردند در آن آبِ زلال ہر یکی با دگری گرم مقال
دیدگان طایفۂ سیم بران گشتہ چون شعلہ زکسوَت عریان
ہمہ دربحر چو دُر کردہ وطن سنبل افشاندہ براطراف چمن

فطرت کی اس مثنوی میں گنگا پر حسیناؤں کے نہانے پر یہ چند شعر بھی شاعر کی خیال پردازی میں مہارت کا ثبوت ہیں:

گشتہ عریان زلباسِ گلگون ہمچو خورکزشفق آید بیرون
راہِ نظارگیان بست زتاب فتنہ برخاست چو بنشست در آب
کرد در آب تنش جلوہ ز نور چون می صاف زمینا ی بلور

ضمنی طور پر عرض کردیا جائے کہ غالب کا یہ اردو شعر زبان زد خاص و عام ہے:

ایک نوبہار ناز کوتاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغِ مے سے گلستان کیے ہوئے

بنارس کی عشقیہ داستان پر فطرت کی مثنوی کا یہ بیت ملاحظہ فرمائیے جو اوپر بھی نقل ہوا ہے:

نازنیناں بہ رخ ہمچو مہر از می حسن برافر وختہ چہر

(نازنینوں کو دیکھو، ان کے چہرے خورشید کی طرح روشن ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حسن کی شراب سے ان کے چہرے دمک رہے ہوں)

فطرت و غالب کے ان دونوں اشعار میں خیال کی بڑی مماثلت ہے۔

علی حزین فارسی کے معروف اور صاحب طرز شاعر ہیں۔ یہ ۱۷۳۴ء میں بنارس میں مقیم ہوئے اور دفن بھی اسی شہر میں ہیں۔ یہ وہی حزین ہیں جنہوں نے اپنی زیرِلب مسکراہٹ سے غالب کی بے راہ روی کی انہیں اطلاع دی تھی۔ [۸]

اہلِ بنارس کی تعریف میں ان کا یہ شعر جوان کے ایران سے مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں، زبان زدِ خاص و عام ہے:

از بنارس نروم معبد عام است این جا ہر برہمن پسرِ لچھن ورام است این جا

بنارس اور اہل بنارس کے بارے میں اِن کے یہ اشعار بھی اس شہر سے حزیں کے تعلق خاطر کے غماز ہیں:

پری رخانِ بنارس بہ صد کرشمہ و ناز پی پرستش مہدیو چون کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنندو بہ سنگ پامالند زہی شرافتِ سنگ و زہی لطافت گنگ

حزیں اس شعر میں بھی بنارس کے برہمن زادوں کو اپنا ایمان خراب کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:

برہمن زادہ ای، زنار بندی بردہ ایمانم کہ سودا می کند با کفر زلفش دین و ایمان را

عارف علی شاہ خراسانی، امجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے تھے۔ رند مشرب صوفی تھے ۱۸۵۷ء میں وہ سندیلہ میں مقیم تھے۔ راجہ درگا پرشاد مہر کے ہمراہ لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ بنارس بھی آئے۔ بنارس کے عشوہ گروں نے انہیں بھی کہیں کا نہیں چھوڑا تھا:

عشوہ گرِ بنارس کشت مرا بنارس کشت مرا بنارس عشوہ گرِ بنارس[۴]

ایک بیاض میں منقول بنارس کی تعریف میں ایک قصیدہ کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ یہ پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہا ہے۔ ایک بیاض کا خطی نسخہ ایران ہاؤس، نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ یہ بیاض کس نے تیار کی تھی، اس کی کتابت کس سال ہوئی، علم نہیں ہو سکا۔ بظاہر یہ انیسویں صدی میں کتابت کی گئی تھی۔ اس کے کاتب محمد فاضل صدیقی ہیں اور یہ بیاض کبھی بنارس کے ایک حکیم محمد عمر کی ملکیت رہی ہے۔ یہ دو فصلوں میں منقسم ہے۔ پہلی فصل میں قدیم و جدید فارسی شعرا کے قصائد کا انتخاب اور دوسری میں غزلیات کا انتخاب ہے۔ اس میں ایک قصیدہ عبدالسبحان بن عبدالسلام معروف بہ شیخ سبحانی نقشبندی صدیقی ساکن موضع کرائی شامل ہے۔ شیخ سبحانی جو دہلی میں بھی رہے تھے، سیّد جلال بخاری دہلوی کے مرید تھے۔ کاتب بیاض محمد فاضل صدیقی، شیخ سبحانی کے بڑے بھائی تھے۔ یہ خاندان صاحب علم و فضل نظر آتا ہے، ممکن ہے محمد فاضل صدیقی جو اس بیاض کے کاتب ہیں، وہی اس کے مرتب بھی رہے ہوں۔

اس میں بنارس کی تعریف میں یہ قصیدہ اس عنوان سے درج ہے:

قصیدۂ شیخ سبحانی در صفت بلدۂ بنارس بیان نمودہ۔

یہ قصیدہ تیس ابیات پر مشتمل اور صاحب قصیدہ کی فارسی شاعری میں اعلیٰ استعداد کا ترجمان ہے۔ چند ابیات ملاحظہ فرمائیے:

خوشا گلزار و بستانِ بنارس خوشا اَزہار و ریحانِ بنارس
خوشا در کوچہ ہای پُر نزاہت تماشای دبستانِ بنارس
چو غنچہ کرد لال آشفتگان را دلال و غنجِ خوبان بنارس
کنارگنگ و سنگین فرشہایش صف خوبان در اشنانِ بنارس
صبا گیسوی خود را کردہٗ مشکین ز خاک عنبر افشانِ بنارس
شنیدہ وصفِ نعمتہا ز ارواح ملایک گشتہ مہمانِ بنارس
ستارہ تا خرد ازوی صفائی فلک در زیر دکان بنارس
دریدہ خرقہٗ دستار بندان نگاہ کج کلاہانِ بنارس
ثباتِ پای تقوی رابینداخت ہوای سیم ساقان بنارس
رمیدہ در جہان ناپدیدی ہما از شرمِ مرغان بنارس
بہ جز لعلِ جمال وگوہرِ حسن نباشد ہیچ، در کانِ بنارس
نظر بازانِ روم وچین بخوبی ہمہ گشتند حیرانِ بنارس

علاّمہ اقبال نے بھی بنارس کے ایک فاضل برہمن کی تعریف کی ہے۔ ان کی ایک نظم "حکایت شیخ و برہمن' مکالمہٗ گنگا وھمالہ درمعنی این کہ تسلسل حیاتِ ملّیہ ازمحکم گرفتن روایاتِ مخصوصہٗ ملّیہ می باشد" میں بنارس کے اس برہمن کے علم وفضل اور اپنے مخصوص میدان عمل میں اس کی امتیازی شان میں یہ ابیات شامل ہیں:

در بنارس برہمنی محترم سرفرو اندر یم بود و عدم
بہرہٗ وافر زحکمت داشتی با خدا جویاں ارادت داشتی
ذہن او گیرا و ندرت کوش بود با ثریا عقل او ہمدوش بود
آشیانش صورتِ عنقا بلند مہرومہ برشعلہٗ فکرش سپند

دہلی سے بنارس تک کے سفر میں غالب قیامت سے گزرے تھے۔ طبیعت بھی شدید خراب رہی تھی۔ وہ بنارس بھی بیمار ہی پہنچے تھے۔ یہاں کی آب وہوا نے ان کی طبیعت

پر خوشگوار اثر ڈالا۔ان کے امراض میں افاقہ ہوگیا۔انہوں نے نشاط وانبساط محسوس کیا،طبیعت رنگ پر آگئی اوراس کا ثبوت ہے یہ مثنوی چراغ دیر بنارس کی جن مذہبی، سماجی اور جغرافیائی خصوصیات کا غالب نے اس مثنوی میں ذکر کیا ہے، وہ غالب کے پیشرو فارسی شعرا کے لیے بھی قابلِ توجہ رہی تھیں، لیکن غالب نے جس تفصیل سے بنارس کے انِ امتیازات کو بیان کیا ہے وہ غالب سے ماقبل، بنارس سے متعلق فارسی شعرا کے کلام میں ندرت سے نظر آتی۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کسی فارسی شاعر نے، اب تک کی اطلاع کے مطابق بنارس پر کوئی الگ سے مستقل مثنوی نہیں کہی۔

غالب نے اس مثنوی میں بنارس کے رنگ ونور ونکہت سے متعلق نئی نئی تراکیب تراشی ہیں۔مثلاً مینو قماش، گلشن ادائی، قیامت قامتان، انہوں نے یہاں کے حسینوں کو جانہای بی تن کہا، سراپا نور ایزد اور ہیولیٰ شعلہ طور کہا۔

آسمان کے ماتھے پر شفق کو قشقہ کہا، اوراس عبادت خانۂ ناقوسیان کو کعبۂ ہندستان کہا۔اور ایک روشن بیان سے یہ راز فاش کرایا کہ دنیا میں ہر قسم کی برائیوں کے باوجود قیامت نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ خالق کائنات کو بنارس کو نیست ونابود کرنا منظور نہیں۔گنگا، اس کی موجوں اوراس کی جلوہ سامانیوں پر اس مثنوی میں غالب کے یہ دو بیت اس نابغۂ روزگار شاعر کی خلاقانہ طبیعت کے ترجمان ہیں:

زبس عرض تمنائی کند گنگ   زموج آغوشہا وا می کند گنگ

زتاب جلوہ ہا بی تاب گشتہ   گہرہا در صدفہا آب گشتہ

پروفیسر حنیف نقوی صاحب نے ان کا یہ منظوم ترجمہ کیا ہے:

لب گنگا پہ ہے اک عرضِ خاموش   چلی آتی ہیں موجیں کھولے آغوش

غضب جلووں کی ہے شعلہ فشانی   گہر بھی ہیں صدف میں پانی پانی

یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ غالب نے اپنے اردو خطوط میں صرف دو ایک جگہ بنارس میں اپنے قیام کے بارے میں محض اجمالی اشارے کیے ہیں، لیکن ان کے چند فارسی خطوط میں جو کلکتے کے قیام کے دوران لکھے گئے تھے، بنارس کے کوائف تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔[16] ان خطوط میں درحقیقت غالب نے بنارس کے بارے میں وہ سب کچھ ہی بیان کر

دیا ہے جو وہ اپنی مثنوی چراغ دیر میں نظم کر چکے تھے۔اس طرح یہ خطوط خود چراغِ دیر کے مطالب کی تصدیق اور انہیں سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

حواشی

ا۔الہ آباد میں ایک روزہ قیام، وہاں سے بنارس تک کا سفر اور اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ ،ڈاکٹر خلیق انجم ،غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی،۲۰۰۵ء،ص۴۱۔۵۴ نامہ ہای فارسی غالب:علی اکبر ترمذی ،غالب اکیڈمی ،نئی دہلی،ص۲۰

۲۔کچھ غالب کے بارے میں،قاضی عبدالودود،پٹنہ،۱۹۹۵ء،ص۲۲۰

۳۔غالب نے اپنے ایک فارسی خط میں اپنی اس قیام گاہ کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معمولی اور کثیف جگہ تھی۔دیکھیے:غالب کا سفر کلکتہ.....ص۵۲،گل رعنا:غالب،مرتبہ مالک رام،دہلی ۱۹۷۰ء،ص۲۷

۴۔کچھ غالب کے بارے میں،ص۲۲۰،گل رعنا،ص۲۷

۵۔غالب نے یہ شعر کلکتے میں کہا تھا:

کاش کان بت کاشی در پذیردم غالب بندۂ توام ،گویم وگویدم زناز:آری

۶۔کتاب ماللھند:البیرونی،تصحیح سخاؤ(E.C.Sachau)،لندن ۱۸۸۷ء،ص۴۰وغیرہ

۷۔تاریخ فیروز شاہی:شمس سراج عفیف،تصحیح مولوی ولایت حسین،کلکتہ ۱۸۹۰ء

۸۔توزک بابری:ظہیرالدین بابر،A.S.Beveridge،۱۹۰۵ء،ص۱۰۵

۹۔خلاصتہ التواریخ:سبحان رائے بھنڈاری،تصحیح ظفر حسن،دہلی ۱۹۱۸ء،ص۲۴۱۔۲۴۲

۱۰۔ Mughals in India, A Bio-Bibliographical survery of MSS. :ڈ.این،مارشل،لندن ۱۹۶۷،ص۲۰۶

۱۱۔.....Mughals in India،ص۴۷

۱۲ Cataloge of persian Mss. in the Library of India office:ہرمن اتھے،آکسفورڈ،۳۷۔۱۹۰۳،ص۱۷۲۵،۲۹۰۶

۱۳۔ A Concise Descreptive Catalogue of the Persian Mss. in the Collection of the Asiatic Society of Bangal: ایوانف،کلکتہ ۱۹۲۴-۲۶، شمارہ ۱۳،۱۷۱، انڈیا آفس لائبریری کٹالوگ،ص ۱۹۵۴

۱۴۔انڈیا آفس لائبریری کٹالوگ،ص ۱۹۶۲

۱۵۔ Catalogue of the Persian and Arebic Mss in the Oriental library at Bankipur vol,8,calucutta,1908-1933: عبدالمقتدر،شمارہ ۶۰۸ اور Persion literature: A Bio-Bibliogeraphical survey: سی۔اے استوری،لندن،۵۳-۱۹۲۷،شمارہ ۶۹۹

۱۶۔خدابخش لائبریری کٹالوگ،ج ۷،شمارہ ۶۰۷

۱۷۔مارشل،شمارہ ۳۱۸

۱۸۔کاروانِ ہند:احمد گل چین معانی،انتشارات آستانِ قدس،مشہد،۱۳۶۹،ص ۱۵۸

۱۹۔ کاروانِ ہند میں محسن کے احوال ان ماخذ پر مبنی ہیں :صبح گلشن: محمد صدیق حسن خان،بھوپال ۱۲۹۵،ص ۳۷۳،روز روشن ،بھوپال ،ص ۵۰۲،عرفات العاشقین،ورق ۷۰۸-۷۰۹

۲۰۔کاروانِ ہند،ص ۱۲۹۴ پر ان کے حالات صبح صادق (خطی نسخہ) کے اندراجات پر مبنی ہیں۔

۲۱۔کاروانِ ہند،ص ۲۴۰۶ پر ان کے احوال ہفت اقلیم رازی ج ۳،ص ۱۲۱ اور عرفات العاشقین،ورق ۷۲۶-۷۶۳ سے ماخوذ ہیں۔

۲۲۔کاروانِ ہند،ص ۱۴۱۹ پر ان کے احوال کا ماخذ ریاض الشعرا از علی قلی والہ داغستانی اور صبح گلشن ہیں۔

۲۳۔مارشل،ص ۶۰،استوری،ص ۷۶۱-۷۲۶

۲۴۔خدابخش لائبریری کٹالاگ،ج ۷،ص ۷۰۴-۷۰۶

۲۵۔استوری،ص ۷۶۱

۲۶۔مارشل،ص ۶۰،یہ تذکرہ علامہ شبلی نے لاہور سے ۱۹۰۶ء میں شایع کیا ہے۔

۲۷۔ خدابخش لائبریری کیٹالاگ، ج ۷، ص ۷۰۸

۲۸۔ :Catalouge of the Persian Mss. in the British Musem

سی۔ ریو، لندن ۸۳۔۱۸۷۹، ج شمارہ ۱۰۳۳/۳

۲۹۔ ریو، ج ۳، شمارہ ۴۱۰، اسٹوری، ص ۷۰۰۔۷۰۲

۳۰۔ دبستانِ مذاہب کے مصنف کے نام کے بارے میں اختلاف چلا آرہا تھا۔ پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب نے اپنے ایک مقالے (''دبستانِ مذاہب''، معارف، فروری ۲۰۰۴، ص ۱۴۶۔۱۴۸) میں اس کتاب کے اس قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے جو صاحب دبستانِ مذاہب کے شاگرد مجدالدین محمد نے مصنف کے اصل نسخے سے اس کا مقابلہ کیا تھا۔ اس میں مجدالدین محمد نے اپنے استاد کا پورا نام اس طرح لکھا ہے:

ہرزاد ذوالفقار، آذر ساسانی

۳۱۔ دبستانِ مذاہب، اردو ترجمہ رشید احمد، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۲۰۰۲، ص ۱۹۳

۳۲۔ دبستان مذاہب، ص ۱۹۴

۳۳۔ دبستان مذاہب، ص ۱۷۲

۳۴۔ دبستان مذاہب، ص ۶۳

۳۵۔ طغرا کے احوال زندگی کے لیے دیکھیے: تذکرۂ نصرآبادی: محمد طاہر نصرآبادی، تہران ۱۳۷۱، ص ۳۴۰، سروِ آزاد: غلام علی آزاد بلگرامی، حیدرآباد ۱۹۱۳ء، ص ۱۲۴، طغرا نے ہندستان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا تھا۔ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

زبنگالہ تا احمد آباد و سند
شدم کوچہ پیمای ہر شہر ہند

۳۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون جس میں اس عشقیہ داستان کی مختلف روایات کا مفصل ذکر ہے: میر کی مثنوی دریائے عشق اور مصحفی کی مثنوی بحر المحبت کے فارسی مآخذ، غالب نامہ، شمارہ ۱۰، جنوری ۲۰۰۵

۳۷۔ بینش کی یہ مثنوی ''مجموعۂ مثنویات بینش''، سالار جنگ میوزیم، شمارہ ۱۰۹۴ میں شامل ہے۔

۳۸۔ ان کے احوال وآثار پر ڈاکٹر متین احمد نے ''مرزا معز فطرت موسوی :حیات وتصانیف'' کتاب لکھی ہے جو ابھی تک غالباً غیر مطبوعہ ہے۔
۳۹۔ فطرت کے دیوان کا خطی نسخہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی (شمارہ ۳۰۵۱) میں محفوظ ہے۔ اس میں مثنوی بھی شامل ہے۔
۴۰۔ کلیات نثر غالب، نولکشور، ص ۵۱۷
۴۱۔ دیکھئے۔ پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب کا مختصر مضمون ''فارسی میں حدیث بنارس'' مقالات عابدی، انتشارات بخش فارسی دانشگاہ دہلی، ۲۰۰۳م
۴۱۔ پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب نے اس بیاض کا اپنے ایک مضمون میں تعارف کرایا ہے۔ یہ مضمون ابھی شایع نہیں ہوا ہے۔
۴۲۔ نامہ ہای فارسی غالب، ص ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۴، ۲۵

ریحانہ خاتون

غالب کی شخصیت کے دو پہلو ایران اور بنارس کے حوالے سے

زبان کے معاملے میں غالب (تولد ۱۲۱۲ھ/۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء فوت ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ/۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) کا ہندستانی فارسی ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں نظریہ تھا کہ کوئی بھی استناد کا درجہ نہیں رکھتا، وہ اہل زبان نہیں ہوسکتا۔ فارسی کے معاملے میں اہل ایران ہی کی زبان مستند ہے اور وہ شاعر اور ادیب جو ایران سے ہندستان آئے وہ سب کے سب مستند اور قابل تقلید ہیں اور ہندستانی فارسی شاعر و ادیب سب کے سب غیر مستند اور ان کی زبان غیر معیاری ہے۔ اسی نظریے کا نتیجہ تھا کہ ان کی تحریروں نیز ایرانی شعرا اور مصنفین پر اور خصوصیت سے علی حزیں (تولد ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء، فوت ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء) کی تحریروں پر ہندستانی مصنفین نے جن میں خان آرزو (تولد ۱۱۹۹ھ/۱۶۸۷ء فوت ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء) پیش پیش تھے، زبردست حملے کیے۔ غالب حزیں کے طرفدار اور اپنا موازنہ حزیں سے کرتے تھے:

غالب عین حزین است بہ ہنجار برور　　　　موج این بحر مکرر بہ کنار آمد و رفت (۱)

یا　　　بعد از حزین کہ رحمت حق بر رو انش باد

ما کردہ ایم پرورش فن درین چہ بحث [2]

یا غالب مذاق ما نتوان یافتن زما روشیوۂ نظیری وطرز حزین شناس [3]

ایک طرف غالب اپنے کو ہندستان میں رہنے کے قابل نہ سمجھتے ہوئے عجم کی نسبت پر فخر کرتے ہیں:

بود غالب عندلیبی از گلستان عجم من زغفلت طوطی ہندوستان نامیدمش [4]

اپنے کو ترک نژاد اور نسب کو افراسیاب وپشنگ سے نسبت دیتے ہوئے اجداد کو سمرقند سے آنا بتاتے ہیں اور توران کی خاک کو مقدس کہتے ہیں:

غالب از خاک پاک تورانیم لاجرم درنسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی بہ سترگان قوم پیوندیم
فن آبای ماکشاورزی ست مرزبان زادۂ سمر قندیم [5]

غالب نے ہندوستان کی برائی کی اور خاک ہند کو کدورت خیز کیا ہے:

غالب از خاک کدورت خیز ہندم دل گرفت اصفہان ہی یزد ہی شیراز ہی تبریز ہی [6]

اور اپنے کو نصیحت کرتے ہوئے ہندوستان سے چلے جانے کی تلقین کرتے ہیں اور ہندوستان میں رہنے کے بجائے اصفہان میں رہنا اور نجف میں مرنا بہتر سمجھتے ہیں:

غالب از ہندوستان بگریز فرصت مفت تست در نجف مردن خوش ست و در صفاہان زیستن [7]

غالب ہند کی آب وہوا سے پریشان ہیں اور خود کو اصفہان وشیراز لے جانا چاہتے ہیں:

غالب از آب وہوای ہند بسمل گشت نطق خیز تا خود را بہ صفاہان وشیراز افکنم [8]

خود اپنے کو ہند سے گرفتہ خاطر کہتے ہیں اور ان کے احباب وآس پاس کے لوگ ان کو آوارۂ عجم کہتے ہیں:

گرفتہ خاطر غالب ز ہند واعیانش برآن سرست کہ آوارۂ عجم گردد [9]

ان کی نظر میں ہندوستانی ناقدرے ہیں اور سنگ وگہر کی شناخت نہیں کرسکتے اس لیے ایسے ملک اور ایسے لوگوں کے درمیان رہنا اور طبع آزمائی کرنا بے سود ہے:

غالب سخن از ہند بروں بر کہ کس این جا سنگ از گہر وشعبدہ ز اعجاز ندانست [10]

وہ ایک جگہ اصفہان وہرات کو اپنی منزل بتاتے ہیں:

غالب ز ہند نیست نوائی کہ می کشم　گوئی ز اصفہان وہرات تمیم ما[۱۱]

راقم کی اب تک کی گفتگو سے غالب کی شخصیت کا ایک پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ آیئے اب ہم ان کو دوسری طرح دیکھیں اور پرکھیں اور ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو سے روشناس ہوں۔

اپنے چچا کے قتل کے بعد حکومت انگلیسیہ کی طرف سے کچھ مدد کی فراہمی ہو جایا کرتی تھی۔ اگر چہ یہ مدد نہایت مختصر تھی اور صرف روزانہ اخراجات کی بمشکل متحمل ہوتی تھی لیکن اسی درمیان ان کے اور ان کے عزیزوں کے درمیان خاندانی مسائل پر کچھ اختلاف ہوا جس کی وجہ سے وہ خاصے رنجیدہ خاطر رہنے لگے:

گردہم شرح ستم ہای عزیزان غالب　رسم امید ہما نا زجہان برخیزد[۱۲]

یا

آہ از اقربای بی آزرم　داد از حاکمان بی انصاف[۱۳]

بالآخر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کلکتہ چلنا چاہیے اور اس مالی کمک میں اضافے کے لیے اعلیٰ حکام انگلیسیہ سے گزارش کی جائے۔ اس طرح اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالب اندرونی طور سے پریشان رہنے لگے تھے اور دہلی سے جدائی ان کو شاق گذرنے لگی تھی:

چہرہ اندود بہ گرد و مژہ آغشتہ بہ خون　خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنوان رفتم

ہم جگر تفتہ زکین خواہی اغیار شدم　ہم دل آزردہ زبی مہری خویشان رفتم[۱۴]

اگر چہ غالب سفر سے کتراتے اور مسافرت کی پریشانیوں سے گھبراتے تھے لیکن مجبوراً سفر کلکتہ اختیار کرنا پڑا۔ اس طرح راستے میں کچھ مدت باندہ، لکھنؤ اور کچھ بنارس میں ٹھہرے اگست ۱۸۲۶ میں ۲۹ سال کی عمر کا ہمارا شاعر سفر کلکتہ اور دہلی سے جدائی پر ماتم کناں ہے:

پیمودہ ام درین سفراز پیچ وتاب عجز　درہر قدم ہزار بیابان وکوہسار

داغی بہ دل ز فرقت دہلی نہادہ ام　کش غوطہ دادہ ام بہ جہنم ہزار بار

بخت از سوادِ کشور بنگالہ طرح کرد　برخویش رفت ماتم ہجران آن دیار[۱۵]

اب آیئے ہم دیکھتے ہیں مثنوی چراغ دیر میں غالب نے بنارس جو ہندستان کا ہی

ایک شہر ہے کس کس طرح اور کن کن الفاظ میں تعریفیں کی ہیں۔ بنارس پہنچنے پر وہاں کی فضا اور آب و ہوا ان کے لیے جنت نگاہ اور سرمایۂ نشاط ثابت ہوتی ہے حتی کہ بیماری کے اثرات دوران سفر جو ان پر غالب آ گئے تھے زائل ہو گئے اور جسم و جاں میں توانائی کی نئی روح دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ یہاں کے مناظر میں دلفریبی کی وہ شان نظر آئی کہ مسافرت کی تکلیفیں اور دہلی سے دوری کا غم دور ہو گیا۔ وہ بنارس کو دلی کا نعم البدل خیال کر کے یہاں سکونت پذیر ہونے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس لالہ زار یعنی بنارس میں ٹھکانہ بنایا جا سکتا ہے اور وطن سے جدائی کا داغ دل سے بھلایا جا سکتا ہے۔ یہ پھولوں کی ایسی سرزمین ہے جس پر ان کا دل فریفتہ ہو گیا ہے۔ بنارس کو بری نظر سے بچانے کی خدا سے دعا کرتے ہیں اور اس کو دنیا میں جنت سے تشبیہ دی ہے اور پھر کہتے ہیں کہ کسی نے بنارس کو چین سے تشبیہ دے دی پھر کیا کہنے یہ تشبیہ بنارس کو ناگوار گذری کہ آج تک گنگا کی موج اس کے ماتھے کا بل بنی ہوئی ہے:

سپس در لالہ زاری جاتوان کرد — وطن راداغ استغنا توان کرد
بہ خاطر دارم اینک گل زمینی — بہار آئین سواد دل نشینی
تعالی اللہ بنارس چشم بددور — بہشت خرم و فردوس معمور
بنارس راکسی گفتا کہ چین است — ہنوز از گنگ چینش برجبین است [۲]

پھر کہتے ہیں کہ آواگون یعنی وہ عقیدہ کہ روح ایک قالب (ڈھانچے) سے نکل کر دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے، اس اصول پر عقیدہ رکھنے والوں کا یہ خیال ہے کہ جو بنارس میں مرجاتے ہیں وہ زندہ رہتے ہیں اگر چہ وہ جسمانی شکل اختیار نہیں کر سکتے اور چشم ظاہر بین کے سامنے نہیں آ سکتے۔ اس کو آپ بنارس کا سحر، جادو یا شعبدہ بازی کہیے یا یہاں کی آب و ہوا کا معجزہ کہ یہاں مرنے والے سب کے سب قالب بدل کر زندہ رہتے ہیں:

تناسخ مشربان چون لب کشایند — بہ کیش خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندران گلشن بمیرد — دگر پیوند جسمانی نگیرد
زہی آسودگی بخش روان ہا — کہ داغ چشم می شوید زجان ہا [۳]

غالب کا خیال ہے کہ اس شہر کی خوبی یہ ہے کہ یہاں کی عام گھاس پھوس بھی گویا

باغ لگتی ہے۔ چاہے بہار کا موسم ہو یا خزاں یا گرمی ہو یا سردی ہر موسم میں یہاں کی فضا جنت کی طرح معلوم ہوتی ہے اس شہر کی آبادی بت پرستوں کی آبادی ہے اور عبادت گزاروں کے لیے تیرتھ استھان اور یہ شہران کی نظر میں واقعی کعبہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے وہاں کے لوگوں کی بھی خوب خوب تعریفیں کی ہیں:

عبادت خانۂ ناقوسیان است　　ہمانا کعبۂ ہندوستان است[۱۸]

اختر حسن صاحب نے اس کا شعری ترجمہ اس طرح کیا ہے:

بنارس کو عبادت خانۂ ناقوسیاں کہیے　　بنارس کو بجا ہے کعبۂ ہندوستان کہیے[۱۹]

کاشی اور بتان کاشی کی تعریف فارسی غزل کے مقطع میں اس طرح کی ہے:

کاش کان بت کاشی در پزیردم غالب　　بندۂ توام گویم' گویدم زناز آری[۲۰]

یعنی کاش ایسا ہو کہ وہ بت کاشی مجھے اپنالے اور جب میں کہوں کہ میں تیرا ہوں تو وہ کہے کہ ہاں مجھے معلوم ہے۔ اسی طرح ایک اور فارسی غزل ہیں:

نخواہم از صف حوران زصد ہزار یکی　　مرابس است زخوبان روز گار یکی
دم از ریاست دہلی نمی زنم غالب　　منم زخاک نشینان آن دیار یکی[۲۱]

یعنی اگر ہزاروں حوریں بھی میرے سامنے لائی جائیں تو وہ بے سود ہیں۔ تو اسی دنیا یعنی بنارس کی حسینوں میں سے ایک حسینہ مل جائے وہی میرے لیے کافی ہے۔

انیسویں صدی کا زمانہ اعصاب شکن تھا' مادی سہارے ختم ہو رہے تھے۔ جمی جمائی تہذیب کے اپنے پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ یہ دور ایک حساس دور تھا' ہندوستانیوں پر اضمحلال طاری تھا' غالب کی پوری زندگی جدوجہد پر مبنی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے عجب خلاق ذہن دیا تھا۔ غالب نے ایسے وقت میں بھی غزل میں بھی عجیب وغریب موضوع پر غور کیا۔ ایران ایک بڑی تہذیب کا نام ہے اور جب بڑی تہذیبوں میں روابط استوار ہوئے تو وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ ایران پر عربوں نے ۲۱ھ میں حملہ کیا اور ایرانی عربوں سے شکست کھا گئے تھے جس سے وہ دکھی تھے اور یہ دکھ ان کی گفتگو اور تحریروں سے جھلکتا ہے غالب کو بھی ایرانیوں کی یہ شکست پسند نہ آئی تو انہوں نے اس کے دوسرے پہلو پر غور کیا اور یہ صرف غالب کا ہی ذہن تھا کہ انہوں نے ایرانیوں کی توجہ اس طرف مرکوز کی کہ تم اس

شکست سے فضول ہی دکھی ہوئے ہو۔ہاں یہ درست ہے کہ انہوں نے تمہارے آتشکدے جلا دیے' بت خانے گرادیے' شاہان عجم کے جھنڈوں میں سے موتی و گہر نوچ ڈالے' ترکان پشنگی (اجداد افراسیاب) کے سر سے تاج اتارلیا جس سے تم نے سمجھ لیا کہ عربوں نے تم کو شکست دی' لیکن یہ شکست شکست نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فتح اس میں ہے کہ اس شکست کے بعد ہی تمہارے یہاں ایسی نادر و نایاب تالیفات ظہور میں آئیں جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکے اور کلام کی پیشانی پر کیانی بادشاہوں کیکاؤس' کیخسرو' کیقباد' کی لہراسپ جیسے عظیم الشان بادشاہوں کی طرح شان وشوکت' دبدبہ اور نور دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ عربوں نے تمہارے تاج سے گوہر نکال ڈالے لیکن وہ گوہر تمہاری دانش اور سوچ بوجھ میں جڑ گئے اور اس شکست کے بعد ہی تم میں ابن سینا اور امین احمد اور رازی جیسی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں' اس طرح غالب نے ایران سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا:

مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند
سوخست آتشکدہ زآتش نفسم بخشیدند   ریخت بت خانہ زناقوس فغانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم برچیدند   بہ عوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند   بہ سخن ناصیۂ فر کیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بہ دانش بستند   ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند
ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند   تا بنالم ہم از آن جملہ زبانم دادند
دل زغم مردہ و من زندہ ہانا این مرگ   بود ارزندہ بہ ماتم کہ امانم دادند[۲۲]

آیئے آخر میں اب دیکھیں گے کہ غالب اور حزین کے یہاں کیا قدریں مشترک تھیں:

ا۔ غالب ایک طرف قومی یکجہتی' مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی تہذیب کا عاشق اور دوسری طرف ایران سے اس کی والہانہ محبت۔ ایک طرف ہندوستان اور ہندوستانی فارسی کی برائی اور دوسری طرف شیراز' اصفہان' یزد' تبریز وغیرہ ایرانی شہروں میں جانے کی تمنا اور وہاں کی فضا میں سانس لینے کی آرزو۔ لیکن عمر کے دوسرے دور میں جب بنارس کی طرف رخ کیا تو وطن پرست بنے اور ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا' یہاں

تک کہ وہ اس شہر کو اپنی مستقل قیام گاہ بنانے پر بھی آمادہ نظر آئے۔ اُدھر حزین پہلے اپنے وطن ایران کی محبت میں سرشار اور وطن پرست دلی آئے اور جس طرح غالب دہلی اور دہلی والوں سے دل برداشتہ ہو کر بنارس پہنچے حزیں بھی دہلی کے لوگوں سے رنجیدہ خاطر ہو کر بنارس گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی اور انہوں نے اپنے یہاں رہنے کا موقف اس طرح بیان کیا:

از بنارس نروم معبد عام است این جا　　ہر برہمن پسری لچھمن و رام است این جا [۳]

اس طرح دونوں کو ہی بنارس کی آب و ہوا اور ماحول راس آیا۔ دونوں ہی دلی والوں کے رویہ سے دل برداشتہ بنارس سے کبھی نہ جانے کا عزم یہاں تک کہ حزین زندگی کی آخری سانسوں تک وہاں رہے اور ۱۱۸۰ھ میں ان کا وہیں انتقال ہوا جبکہ غالب بہ حالت مجبوری حکومت انگلیسیہ سے وظیفہ میں اضافہ کی خواہش اور امید میں کلکتہ کے سفر کے لیے آمادہ ہوئے۔ حزین اور غالب دونوں کو بھی بنارس کے عوام کی پذیرائی۔ آرزو اور حزین کے علمی معرکے میں غالب حزین کا زبردست حامی۔

غرض یہ کہ یہ وہ نتائج ہیں جو دونوں کے حالات اور شاعری کے مطالعے سے سامنے آتے ہیں اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ باوجود شخصیات کے ادوار میں اگرچہ تقریباً ۵۰، ۶۰ سال کا عرصہ حاوی ہے لیکن خیالات کس طرح ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ غالب بنارس کو ایک مقدس شہر اور مشرقی تہذیب کا گہوارہ بتاتے ہوئے کعبۂ ہندوستان کہتا ہے تو حزین یہاں کے ہر برہمن بچے کو لچھمن اور رام بتاتا ہے۔ ذہنوں کی اس ہم آہنگی کو دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنارس کی فضا نے دونوں کو ہی اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔

حواشی

۱۔ کلیات غالب، ج دوم (قصاید) مرزا اسد اللہ خان غالب، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۴، دیوان غزلیات غالب، میرزا اسد اللہ غالب، تصحیح از دکتر محمد حسن حائری، میراث مکتوب تہران ۱۳۷۷ھ ش، ص ۱۶۴

۲۔ ایضاً ص ۱۶۶، دیوان غزلیات حائری ص ۱۶۶۔

۳۔ ایضاً ۲۵۱
۴۔ ایضاً ص ۲۶۰، دیوان غزلیات حائری ص ۲۶۰۔
۵۔ کلیات غالب، مرزا اسداللہ خان غالب، نولکشور لکھنؤ/ ۱۹۲۵، ص ۱۱
۶۔ کلیات غالب، فاضل ص ۳۵۹
۷۔ ایضاً ص ۳۱۵
۸۔ ایضاً ص ۲۹۷۔
۹۔ دیوان غالب، حائری ص ۱۷۸
۱۰۔ دیوان غالب، فاضل ۱۳۷
۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۳
۱۲۔ احوال و آثار مرزا اسداللہ خان غالب، تصحیح محمد علی فرجاد، انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۷۷ (فارسی) ص ۴۸، دیوان غزلیات، حائری ص ۱۹۶
۱۳۔ احوال ص ۴۸
۱۴۔ ایضاً۔
۱۵۔ کلیات غالب (فارسی) ص ۱۵
۱۶۔ چراغ دیر، منظوم اردو ترجمہ از اختر حسن، حیدرآباد، ۱۹۷۴، ص ۵۷ و مثنویات غالب، ظ۔ انصاری، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۸۳، ص ۴۲۔۴۳۔
۱۷۔ ایضاً ص ۵۶
۱۸۔ ایضاً ص ۶۰
۱۹۔ ایضاً ص ۶۱
۲۰۔ ایضاً ص ۱۵
۲۱۔ ایضاً ص ۲۵
۲۲۔ دیوان غزلیات، حائری، ص ۲۱۵۔۲۱۶
۲۳۔ ترجمۂ اختر حسن، ص ۲۴

ظفر احمد صدیقی

پروفیسر حنیف نقوی بہ حیثیت غالب شناس

غالب اور بنارس کے درمیان ربط و تعلق کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بنارس نے دو اعلا درجے کے غالب شناس پیدا کیے ہیں۔ میرا اشارہ مولوی مہیش پرشاد اور پروفیسر حنیف نقوی کی جانب ہے۔ پیشِ نظر مضمون کا مقصد غالب شناس نقوی کی خدمات کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ہے۔

غالب اردو ادب کی ایسی غیر معمولی شخصیت ہیں کہ اردو کا ہر محقق و ناقد ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔ اس ضمن میں نثار احمد فاروقی مرحوم نے بہت اچھی بات کہی ہے:

> "ہمارے نقادوں اور محققوں کا غالبؔ پر کچھ نہ کچھ لکھنا ایسا ہی ضروری ہو گیا ہے، جیسے مناسکِ حج میں میدانِ عرفات کا قیام کہ اس کے بغیر حج ہی نہیں ہوتا۔"
>
> (تلاشِ غالبؔ ص ۱۳)

لیکن ظاہر ہے کہ غالبؔ پر کچھ نہ کچھ لکھنا اور غالب شناسوں یا ماہرینِ غالبیات کے درمیان کوئی امتیازی مقام حاصل کرنا' دو الگ الگ امور ہیں۔ ہمارے صفِ اول کے

غالب شناسوں میں عبدالستار صدیقی ،مولوی مہیش پرشاد ،قاضی عبدالودود،شیخ محمد اکرام ،مولانا غلام رسول مہر،مولانا امتیاز علی خاں عرشی ،مالک رام اور پروفیسر نذیر احمد کے نام شامل ہیں ۔ان تمام حضرات نے غالبیات کے علاوہ بھی دوسرے متعدد تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں ۔پروفیسر حنیف نقوی بھی محققین کے اسی زمرے میں شامل ہیں۔

پروفیسر نقوی نے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز شعراے اردو کے تذکروں سے کیا۔اس کام کے دوران انہوں نے تحقیق کے اصول و آداب سیکھے۔۱۹۷۶ء میں جب ان کا تحقیقی مقالہ ''شعراے اردو کے تذکرے'' کے نام سے چھپ کر منظرِ عام پر آیا تو مولانا عرشی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

> ''میں نے اس تحقیقی مقالے کو اول سے آخر تک پڑھا۔آپ نے جس لگن سے مسالا اکھٹا کیا ہے،وہ قابلِ داد ہے۔اور جس دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے،وہ مستحقِ تحسین و آفریں ہے۔
>
> (مکتوب بہ نام پروفیسر نقوی،۱۵/اکتوبر ۱۹۷۸ء)

تذکروں پر تحقیق کے دوران پروفیسر نقوی کو درجنوں قلمی تذکرے حرفاً حرفاً پڑھنا پڑے۔ان میں بعض کرم خوردہ و بوسیدہ یا شکستہ و ناخوانا خط میں تھے۔اس طرح انہیں مخطوطات کی قرائت کی مشق و مہارت حاصل ہوگئی۔اس کے ساتھ ہی خستہ و بوسیدہ کتابوں کو دیکھ کر طبیعت پر جو وحشت طاری ہوتی ہے،اس پر انہوں نے بڑی حد تک قابو پالیا۔بلکہ یوں کہیے کہ اس وحشت کو اُنس میں تبدیل کرلیا۔ان دونوں امور نے محقق نقوی کی شخصیت کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔چونکہ تذکروں میں شاملِ تذکرہ اصحاب کے سوانح سے بھی بحث کی جاتی ہے،اور مختلف تذکروں میں سوانحی مواد منتشر حالت میں پایا جاتا ہے،نیز بسا اوقات ان میں تناقض و تضاد بھی ہوتا ہے،اس لیے صحیح و سقیم اور رطب و یابس میں امتیاز بہت دشوار ہو جاتا ہے۔پروفیسر نقوی کو تذکروں پر تحقیق کے دوران ان مراحل سے بار بار گذرنا پڑا۔اس لیے انہیں سوانحی تحقیق سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔چنانچہ انہوں نے تذکروں پر کام کے بعد بھی سوانحی مطالعہ و تحقیق کے اس سلسلے کو جاری رکھا۔

''بہارِ بے خزاں'' کے مصنف منشی احمد حسین سحر کے سوانحی حالات کسی تذکرے یا کتاب میں درج نہیں ہیں۔ انتہا یہ کی ان کے والد کا نام بھی نہیں ملتا۔ پروفیسر نقوی بھی یہ ''طعنۂ نایافت'' بار بار سن چکے تھے۔ یکا یک اندھیرے میں انہیں ایک کرن نظر آئی اور جرسِ غنچہ کی صدا پر وہ بادِ نسیم کی طرح چل پڑے۔ چنانچہ نہایت تلاش و تفحص سے منشی احمد حسین کے خاندان، وطن اور مشاغل وغیرہ سے متعلق جزئیات پر مشتمل ایک مقالہ تحریر فرمایا، جو ۱۹۷۶ء میں نیا دور، لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اسے پڑھ کر مشفق خواجہ نے لکھا:

> ''آپ کا اندازِ تحقیق منفرد ہے۔ احمد حسین سحر کو جس طرح آپ نے تلاش کیا ہے، وہ آپ ہی کا کام ہے......(تلاش و تعارف، ص ۲۷۷)

پروفیسر نقوی اب تذکروں کے دائرے سے باہر آچکے تھے، چنانچہ اب کے انہوں نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو موضوعِ تحقیق بنایا۔ اس کا ایک سبب بنارس سے مہر کا تعلق بھی تھا، کیونکہ وہ بنارس کے قریب واقع موضع چنار کے منصف رہ چکے تھے اور پری رُخانِ بنارس سے ان کے قریبی روابط تھے۔

یہ مہر وہی ہیں، جن کے نام غالب نے ''چُنا جان اور منا جان'' والا مشہور خط لکھا ہے۔ غالب سے ان کے روابط ۱۸۵۸ء میں قائم ہوئے اور غالب کی وفات تک استوار رہے، لیکن اس گیارہ سالہ مُدت میں دونوں کو ایک دوسرے سے کبھی ملاقات کا موقع ہاتھ نہیں آیا۔ مہر سے متعلق پروفیسر نقوی کا مقالہ ۱۹۸۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مقالے نے بھی اہلِ نظر کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ چنانچہ پروفیسر سید حسن نے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

> ''حنیف نقوی صاحب کا ایک طویل مقالہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے عنوان سے ''نیا دور......میں دیکھا۔ بڑی محنت اور توجہ سے لکھا گیا ہے۔ حوالوں کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ نقوی صاحب کی نظر کتنی وسیع و عمیق ہے۔''

(تلاش و تعارف ص ۲۷۸)

پروفیسر نقوی کا طریقۂ تحقیق وتصنیف یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر کام کرنا چاہتے ہیں، اس سے متعلق مواد جمع کرتے رہتے ہیں۔ اکثر وبیشتر یہ سلسلہ برسوں پر محیط ہوتا ہے۔ پھر موضوع کے 'مانہٗ' اور 'ماعلَیہ' سے متعلق جب تک کما حقہ، آگاہی حاصل نہیں کر لیتے، قلم نہیں اٹھاتے۔ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی۔ مہر پر کام کے دوران قدم قدم پر انہیں غالبؔ کے خطوط اور دیگر رسائل وکتب وغیرہ کا مطالعہ کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا غالبؔ بہ راہِ راست ان کی توجہ کا مرکز بن گئے، چنانچہ اسی سال ان کے دو مضامین اور شائع ہوئے۔ ایک ''منشی نول کشور اور غالبؔ'' دوسرے ''غالبؔ سے منسوب ایک شعر''۔

اس کے بعد سے پروفیسر نقوی نے غالبؔ اور متعلقات غالبؔ کو اپنی تحقیق وتصنیف کا محور بنا لیا۔ چنانچہ اگلے دس سال کے دوران غالبیات سے متعلق ان کے شائع شدہ مقالات کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

۱۔ غالبؔ کا سفرِ کلکتہ جنوری ۱۹۸۱ء (غالب نامہ، نئی دہلی)
۲۔ ولایت علی خاں ولایت وعزیز صفی پوری تمبر ۱۹۸۱ء (دو ماہی اکادمی لکھنؤ) (شاگردِ غالبؔ)
۳۔ غالبؔ کی ایک غزل اور مرزا یوسف جولائی ۱۹۸۲ء (ماہ نامہ آجکل، نئی دہلی)
۴۔ تلامذۂ غالب پر ایک نظر جنوری فروری ۱۹۸۳ء (دو ماہی اکادمی لکھنؤ)
۵۔ غالبؔ کا سالِ ولادت جنوری ۱۹۸۵ء (غالب نامہ، نئی دہلی)
۶۔ غالبؔ کا ایک شعر ستمبر ۱۹۸۵ء (ہماری زبان، نئی دہلی)
۷۔ تلامذۂ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر جولائی اگست ۱۹۸۶ء (دو ماہی اکادمی، لکھنؤ)
۸۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ایک جائزہ (تین قسطیں) ستمبر ۱۹۸۶ء تا فروری ۱۹۸۷ء (دو ماہی اکادمی، لکھنؤ)
۹۔ غالبؔ اور عیوبِ قوافی مارچ ۱۹۹۰ء (ہماری زبان، نئی دہلی)
۱۰۔ غالبؔ کے عہد میں ڈاک کا نظام جنوری ۱۹۹۱ء (غالب نامہ، نئی دہلی)

غالبؔ کے تلامذہ واحباب اور خود غالبؔ پر تحقیق کے دوران پروفیسر نقوی نے غالبؔ کے خطوط، دیوانِ اردو، دیوانِ فارسی اور دوسری تصانیف کو بار بار پڑھا۔ اس کے

علاوہ ان کے تلامذہ، احباب اور معاصرین کی بھی صدہا کتابیں مختلف مناسبتوں سے پڑھ ڈالیں۔ اس طرح انہیں غالب، ان کے احباب و معاصرین اور عہدِ غالب کے بارے میں بہ طورِ خاص سوانحی تحقیق کے حوالے سے غیر معمولی طور پر وسیع معلومات حاصل ہوگئیں۔ قدرت نے انہیں اصابت رائے اور قوی حافظے سے بھی نوازا ہے۔ ان دونوں امور نے افادیت کے لحاظ سے ان کی وسعتِ معلومات کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب شناس کی حیثیت سے وہ ایک خاص مرتبہ و مقام کے حامل ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے، وہ اپنے پیش روؤں اور بزرگوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں، لیکن ان کی ہر بات سے اتفاق ضروری نہیں سمجھتے۔

متذکرہ بالا امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالبیات سے متعلق پروفیسر نقوی کے مضامین و مقالات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی صحیح قدر و قیمت واضح ہوگی۔ ''غالب کا سفر کلکتہ'' اور ''غالب کا سالِ ولادت'' ان کے وہ مضامین ہیں، جن میں انہوں نے اپنے پیش روؤں اور معاصرین سے اختلاف بھی کیے ہیں، ان کے بیانات کی تصحیح بھی کی ہے، نئی اور وسیع معلومات کا انبار بھی لگا دیا ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی دی ہے۔

استدراک یعنی دوسروں کی تحریروں پر علمی گرفت بھی پروفیسر نقوی کا ایک امتیازی وصف ہے۔ بعض حضرات اس پر ناراض ہوتے ہیں اور اسے تخریبی تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ یہاں غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے:

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسد! پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

اصل یہ ہے کہ علم و فن کی کسی خاص شاخ میں برسوں کے ریاض کے بعد جب کسی شخص کو ملکۂ راسخہ حاصل ہو جاتا ہے تو دوسروں کی تحریروں پر نظر پڑتے ہی اس کی خامیاں اس پر عیاں ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو اصحابِ نظر کہتے ہیں۔ ان کی آرا بڑی قیمتی اور وقیع ہوتی ہیں۔ انھی لوگوں کے بارے میں شیخ سعدی نے کہا ہے:

بنمائے بہ صاحب نظرے گوہرِ خود را عیسیٰ نہ تواں گشت بہ تصدیقِ خرے چند

مالک رام کی ''تلامذۂ غالب'' اور ڈاکٹر خلیق انجم کی ''غالب کے خطوط'' پر پروفیسر نقوی کے استدراکات اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ جناب مالک رام نے اپنی کتاب

کے طبعِ ثانی کے دیباچے میں ان کی افادیت کا نہ صرف اعتراف بلکہ اس پر اظہارِ تشکر و امتنان بھی کیا ہے۔

غالبؔ کے شاگرد ولایت علی خاں ولایتؔ و عزیزؔ سے متعلق پروفیسر نقوی کا مقالہ پڑھ کر پروفیسر مختار الدین احمد نے ان کے نام خط میں تحریر فرمایا:

> مجھے عزیزؔ کی چند قدیم تصانیف ملی تھیں اور ان پر مضمون لکھنے کا ارادہ تھا کہ آپ کے مقالے کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ مجامع شعری پر جو سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانا بے سود نظر آتا ہے۔

(تلاش و تعارف ص ۲۷۸)

''غالب کے عہد میں ڈاک کا نظام'' پروفیسر نقوی کا وہ مقالہ ہے، جس میں انہوں نے خطوطِ غالب سے ریزہ ریزہ معلومات فراہم کر کے عہدِ غالبؔ میں ڈاک کے نظام میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مختلف قوانین کا ذکر کیا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس مقالے کے مطالعے کے بعد نظامِ ڈاک کی تاریخ کے حوالے سے بتایا کہ مقالے میں مذکور عہدِ غالبؔ کے متعدد قوانین آج بھی نافذ العمل ہیں۔

۱۹۹۱ء تک آتے آتے پروفیسر نقوی کو یہ احساس شدّت کے ساتھ دامن گیر ہوا کہ غالبؔ سے متعلق مختلف مسائل و مباحث کی تحقیق میں غالبؔ کے فارسی دیوان، فارسی خطوط اور فارسی رسائل و کتب سے جتنا استفادہ ہمارے اردو محققین کو کرنا چاہیے تھا، وہ نہیں کیا گیا۔ اس لیے اب انہوں نے غالبؔ کے فارسی آثار کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور اس سلسلے میں متعدد مضامین و مقالات تحریر کیے، جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ غالبؔ کی چھٹی فارسی مثنوی اپریل ۱۹۹۱ء (ماہ نامہ ایوانِ اردو، نئی دہلی)
۲۔ غالب کے چار غیر مطبوعہ فارسی خطوط اگست ۱۹۹۳ء (آجکل، نئی دہلی)
۳۔ پنج آہنگ۔ ترتیب سے اشاعت تک جولائی ۱۹۹۴ء (غالب نامہ، نئی دہلی)
۴۔ مے خانۂ آرزو سرانجام ۱۹۹۴ء (یادگار نامۂ فخر الدین علی احمد)
۵۔ پنج آہنگ کا قدیم ترین قلمی نسخہ ۱۹۹۶ء (تحقیق تصورات)

۶۔متفرقات غالب جنوری ۱۹۹۷ء (غالب نامہ، نئی دہلی)

۷۔باغِ دودر۔دریافت سے تدوین تک جولائی ۱۹۹۹ء (غالب نامہ، نئی دہلی)

۸۔غالب کے فارسی خطوط دسمبر ۱۹۹۹ء (نیادور، لکھنؤ)

۹۔مثنوی چراغِ دیر کے دو ترجمے دسمبر ۱۹۹۹ء (ہماری زبان، نئی دہلی)

۱۰۔دستنبو۔غالب کا روزنامچہ غدر ۲۰۰۰ء (سہ ماہی اردو ادب، نئی دہلی)

۱۱۔غالب کا ایک فارسی خط اور ان کا سفرِ رام پور جولائی ۲۰۰۲ء (غالب نامہ، نئی دہلی)

۱۲۔تفہیم غالب کی دشواریاں، فارسی خطوط کے حوالے سے دسمبر ۲۰۰۵ (بین الاقوامی غالب سمینار ۲۰۰۵ء)

ان تمام مضامین پر علاحدہ علاحدہ گفتگو کے لیے ایک مستقل مقالے کے وسعت درکار ہے۔ یہاں اجمالی طور پر یہ عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہمارے معروف غالب شناسوں کے یہاں غالب کے فارسی آثار کے حوالے سے مضامین و مقالات کا یہ تنوّع نظر نہیں آتا۔ پھر ان میں جس دیدہ ریزی و محنت پژوہی سے کام لیا گیا ہے، ان کی صحیح معنوں میں داد کوئی صاحبِ نظر قاری ہی دے سکتا ہے، یا پھر شبلی کے الفاظ میں یوں کہیے:

رَسی آں گہہ بہ دردِ من کہ چو من
خامہ گیری و حرف بنگاری

(مقالاتِ شبلی جلد ہشتم ص ۴۹)

''مآثر غالب'' مرتبہ قاضی عبد الودود کا بڑا حصہ غالب کے نادر فارسی خطوط پر مشتمل ہے۔ پروفیسر نقوی نے ۱۹۹۵ء اور پھر ۲۰۰۰ء میں تصحیح و تحشیے کے ساتھ اسے ازسرِ نو مرتب کیا ہے۔ پروفیسر گیان چند جو ''تفسیرِ غالب'' اور ''رموز غالب'' کے مصنف کی حیثیت سے خود بھی غالب شناسوں کی فہرست میں شامل ہیں، اس کتاب پر پروفیسر نقوی کے وقیع حواشی کی داد دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

مجھے اپنے شاگرد حنیف نقوی کی مُشقت دیکھ کر دل سوزی ہوتی ہے کہ ''مآثرِ غالب'' غالبیات کی ایسی کتابِ پارینہ ہے' جس پر بہت کم قارئین توجہّ دیں گے۔ غالب کی فارسی تحریروں میں کس

کو دلچسپی ہے؟ حنیف نے ایسے رسا کے پر اتنی غیر معمولی دیدہ
ریزی کی۔اتنی کاوش سے تو غالبؔ پر ایک مستقل کتاب لکھ سکتے
تھے۔میں اس کتاب کے ایک صفحے کے بھی حواشی لکھنے کا اہل
نہیں ۔حیرت ہوتی ہے کہ حنیف کو غالبؔ سے متعلق
افراد،غالبؔ کی فارسی تحریروں اور فارسی ادبیات کا اتنا گہرا
عرفان ہے۔

(رموزِ غالب ص ۴۳۷)

پروفیسر نقوی دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو بے وجہ دہرانا، یا دوسروں کے نتائج تحقیق کو اپنی طرف منسوب کرنا، یا بہ طور سہل انگاری دوسروں کے اقتباساتِ نثر و نظم کو اپنی تصنیف کا جزو بنانا شیوۂ تحقیق کے منافی تصوّر کرتے ہیں۔اسی طرح عبارت میں بے جا اطناب اور غیر ضروری اعادہ و تکرار بھی انہیں سخت ناپسند ہے۔وہ کسی موضوع پر اسی وقت قلم اٹھاتے ہیں، جب مسئلہ زیرِ بحث سے متعلق نئی معلومات کی فراہمی یا بعض غلط فہمیوں کا ازالہ مقصود ہو۔ان کے اس طرح کے مضامین میں ''غالبؔ اور علامہ فضل حق خیرآبادی'' غالب اور معارضۂ کلکتہ'' اور'' غالب کی مہریں'' بہ طورِ خاص لائقِ ذکر ہیں۔

غالبؔ کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ حذف و اضافہ و ترمیم کے ذریعے اپنے کلام کو خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو میں مصروف رہا کرتے تھے۔یہی حال پروفیسر نقوی کا بھی ہے۔وہ کسی موضوع پر کچھ لکھنے کے بعد بھی نئے مواد کی تلاش و جستجو میں برابر مصروف رہتے ہیں۔غالبیات کے حوالے سے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے مالک رام کی ''تلامذۂ غالب'' پر ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا ''تلامذۂ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر''۔اب مزید معلومات کی روشنی میں ان کا تیسرا مضمون ''تلامذۂ غالب۔بازدید'' کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔

غالبؔ کی زندگی کے بہت سے واقعات نیز ان کے اردو و فارسی خطوط کی تاریخوں وغیرہ سے متعلق امور میں ہجری و عیسوی سنین کی تطبیق میں بہت اختلافات پائے جاتے ہیں۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان امور میں اہلِ تحقیق عام طور پر جنتریوں پر اعتماد

کرتے ہیں۔ یہ جنتریاں قیاسی بنیادوں پر ترتیب دی گئی ہیں۔ اس لیے تاریخوں میں ایک دو دن کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ پروفیسر نقوی نے غالبؔ کی مختلف تحریروں کی مدد سے ایک ''تقویمِ غالب'' تیار کی ہے، جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی معین سال اور مہینے میں غالبؔ کے نزدیک ہجری وعیسوی کی تطبیق کیا تھی؟ پروفیسر نقوی کی تیار کردہ یہ ''تقویمِ غالب'' ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

غالبؔ اور شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی دونوں سے پروفیسر نقوی کا ربط وتعلق اب خاصا دیرینہ اور مستحکم ہو چکا ہے۔ سوان دونوں کا بہ یک وقت حق ادا کرنے کے لیے وہ ''مولوی مہیش پرشاد بہ حیثیت غالب شناس'' کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں، جس کے مواد کی فراہمی میں دس سال سے زائد کی مدت صرف ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اب جلد ہی منظرِ عام پر آ جائے گی۔

پروفیسر نقوی متعارف معنوں میں شاعر نہیں ہیں، لیکن ان کے نتائجِ فکر میں متعدد قطعاتِ تاریخ، منظومات اور تضمینیں وغیرہ شامل ہیں۔ غالبؔ کی مثنوی ''چراغِ دیر'' کا منظوم اردو ترجمہ جوان کا رشحۂ قلم ہے ارباب ذوق کو عموماً اور ڈاکٹر خلیق انجم نیز پروفیسر شمیم حنفی کو خصوصاً بہت پسند ہے۔ چنانچہ ان دونوں کی کتابوں میں اس کے اقتباسات شامل ہیں۔

سلسلۂ زیر بحث کی آخری بات یہ ہے کہ پروفیسر نقوی غایت درجہ محتاط محقق ہیں۔ لہٰذا غالبؔ اور متعلقاتِ غالبؔ کے حوالے سے انہوں نے جو تحقیقی مواد فراہم کر دیا ہے، اس پر بڑی حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اغلاط وتسامحات سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں کہ پاک ذات صرف اللہ کی ہے۔

نسیم احمد

خیر بہوروی اور غالب

خیر بہوروی جن کا اصل نام ابوالخیر تھا' ۱۰-۱۹۰۹ء کے آس پاس اتر پردیش کے ضلع بلیا کے ایک گانو بہوروا میں پیدا ہوئے تھے۔اسی مناسبت سے وہ عام طور پر خیر بہوروی کے نام سے مشہور ہیں۔انہوں نے کسی معروف درس گاہ سے باقاعدہ سندِ فراغت حاصل نہیں کی تھی لیکن مشرقی تہذیب کے پروردہ تھے۔بہ قدرِ ضرورت عربی، فارسی پڑھی تھی' اور اردو مادری زبان تھی۔آدمی ذہن اور طباع تھے۔چنانچہ انگریزی اور ہندی بھی سیکھ لی تھی، بلکہ دونوں زبانیں بخوبی لکھتے، پڑھتے اور بولتے تھے بہوروی مرحوم کا عہد شباب اُس شہر میں گزرا تھا جس کے بارے میں ریاضؔ کا یہ شعر کافی مشہور ہو چکا ہے۔

وہ گلستاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی تھی
بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھ پور آتا ہے

خیر بہوروی کا ذہنی شعور گورکھ پور کی شاعرانہ اور علمی فضا میں پختہ ہوا اور یہیں ریاضؔ، برہم، وسیم خیرآبادی اور مہدی افادی وغیرہ کی صحبتوں میں اُن کے ادبی ذوق کو نشوونما ہوئی۔ابتدا میں شاعری کی طرف مائل ہوئے لیکن جب سید جالب دہلوی نے اپنا رسالہ ہمدم جاری کیا اور خیرؔ کو اس کا نامہ نگار بنایا تو انہیں نثر میں اپنے قلم کے جوہر دکھانے کا

موقع ملا۔

خیر صاحب مردم شناسی اور دوست داری جیسی صفات سے متصف تھے، صاحب حیثیت افراد اور مشاہیر علم وادب کو شیشے میں اتارنے کا فن انہیں آتا تھا، چنانچہ ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی، رام دہاری سنگھ دنکر، نذیر بناری، ہربنس لال شرما، خلیل الرحمٰن اعظمی، حکیم عبدالقوی، مولانا سبط حسن، اعجاز صدیقی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور فراق گورکھ پوری اُن کے دوستوں میں تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، صدر جمہوریہ ہند، ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ، پنڈت جواہر لعل نہرو، وزیر اعظم ہند، ڈاکٹر سمپورنا نند وزیر اعلیٰ اتر پردیش، ڈاکٹر ہمایوں کبیر مرکزی وزیر برائے تعلیم، اور بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر وغیرہ تک اُن کی رسائی تھی، اُن کے نام ایک خط مؤرخہ ۸/جنوری ۱۹۶۲ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیلڈ مارشل ایوب خاں صدر پاکستان سے بھی اُن کی رسم وراہ تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے، نیز غلام رسول مہر، حفیظ جالندھری، حیات اللہ انصاری، عبدالرحمٰن چغتائی۔ عندلیب شادانی، بیگم عندلیب شادانی، نظیر صدیقی، قاضی عبد الغفار، سیماب اکبرآبادی، مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام، نیاز فتح پوری اور پروفیسر محمد مجیب جیسی قلمی شخصیات سے بھی اُن کے روابط اور خط و کتابت تھی۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر اورنگ آباد سے دلی منتقل ہوا تو مولوی عبدالحق نے انجمن کے صدر دفتر میں اپنے معاون کی حیثیت سے خیر صاحب کا تقرر کر دیا۔ وہ ایک اچھے منتظم ثابت ہوئے اور ملک کی تقسیم تک انجمن کے تنظیمی امور بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ملک منقسم ہوا تو انجمن کا شیرازہ بھی بکھرا اور تقریباً دو برسوں کے تعطل کے بعد ۱۹۴۹ء میں جب انجمن کا دفتر دوبارہ علی گڑھ (سلطان جہاں منزل) میں قائم ہوا اور قاضی عبدالغفار اس کے سکریٹری ہوئے تو خیر صاحب معاون سکریٹری مقرر ہوئے۔ انجمن کو اس از سرنو تنظیم و تعمیر میں وہ قاضی صاحب کے برابر کے شریک رہے۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں قاضی صاحب کا انتقال ہوگیا اور نیا ماحول بہوروی صاحب کو راس نہیں آیا چنانچہ ۱۹۵۷ء میں وہ انجمن سے مستعفی ہوگئے۔

خیر صاحب کا انجمن ترقی اردو سے رشتہ منقطع ہوا تو وہ اپنے وطن: بہورو چلے

آئے۔ جوہر صدیقی اور نذیر بنارسی مرحوم وغیرہ سے اُن کے مراسم تھے ہی، لہٰذا بنارس آتے جاتے رہے۔ اُن کی شخصیت میں بڑی کشش تھی، اس نے اہل بنارس کو اُن کا گرویدہ بنا دیا۔ نذیر بنارسی مرحوم کے مشورے پر ۱۹۵۷ء ہی میں 'غالب اکاڈمی، بنارس، کا قیام عمل میں آیا، نذیر صاحب کا گھر ہی اکاڈمی کا صدر دفتر بنا۔ بہوروی نے اپنے منصوبے ''غالب انسائیکلوپیڈیا'' کی ترتیب کے سلسلے میں غالب کی جو نادر تصویریں اکٹھا کی تھیں اُنہیں اسی ادارے سے ۱۹۵۸ء میں 'مرقع غالب' کے نام سے شائع کیا۔ ادبی حلقوں میں 'مرقع' کی بے حد پذیرائی ہوئی چنانچہ حوصلہ پا کر اکاڈمی نے ۱۹۶۰ء میں اس کا ہندی ایڈیشن بعض ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ 'غالب چتر اولی' کے نام سے شائع کیا۔ دستیاب شواہد کے مطابق بہوروی صاحب ۱۹۶۲ء کے اوائل میں مستقلاً بنارس چلے آئے اور نذیر بنارسی مرحوم کے مکان واقع مدن پورہ میں قیام پذیر ہوئے نیز ادبی سماجی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے۔

'مرقع غالب' اور چتر اولی کے علاوہ بنارس اور غالب کے تعلق سے بہوروی مرحوم کا ادبی سرمایہ کچھ زیادہ نہیں۔ راقم الحروف کو کُل تین مضامین دستیاب ہوئے ہیں جن میں غالب، تلامذۂ غالب اور بنارس کا ذکر موجود ہے۔ یہ تینوں مضامین بہوروی مرحوم کے بنارس کے قیام کے دوران معرضِ تحریر میں آئے ہیں۔ سطور ذیل میں اولاً ''مرقع غالب'' اور ''غالب چتر اولی، کا اجمالی تعارف ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔ بعد ازاں مذکورہ مضامین پر گفتگو کی جائے گی۔

مرقع غالب

سرورق پر مرقع غالب، بہ طورِ عنوان درج ہے اور صفحہ ۲ سادہ چھوڑ دیا گیا ہے، صفحہ ۳ کا عنوان ہے ''غالب انسائیکلوپیڈیا کا ایک باب'' صفحہ ۴ پر خطاط اور ناشر وغیرہ کے نام ہیں۔ صفحہ ۵ پر انتساب فدائے اردو مولوی عبدالحق کے نام۔ جن کی بارگاہِ علم ودانش میں مجھے ''غالب انسائیکلوپیڈیا'' مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا'' خیر۔ صفحہ ۶، ۷ سادہ چھوڑے گئے ہیں اور آٹھویں صفحے پر ''تحفہ خیر مجی حافظ شفیق الرحمٰن خاں شفیق الہ آبادی کی خدمت میں غالب کی اس دعا۔ کے ساتھ۔ تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔ مخلص خیر بہوروی صفحہ ۹ اور ۱۰ پر عرض مرتب کے ذیل میں 'غالب کی تصویریں' کے عنوان سے غالب

انسائیکلو پیڈیا شائع کرنے کی غرض و غایت پر ایک مختصر مگر جامع تحریر سپرد قلم کی گئی ہے۔ اس تحریر کے مطابق ۱۹۳۹ء میں (انجمن ترقی اردو کی ملازمت کے دوران) اسے کتابی صورت میں پیش کرنے کا خیال مرتب کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ اور یہ کہ انسائیکلو پیڈیا کا کچھ بے ترتیب حصہ 'اشارات' کے عنوان سے 'نگار، مارچ، مئی اور جولائی ۱۹۵۰ء کے شماروں میں چھپا تھا۔ بایں طور غالب کی تصویروں سے متعلق مرتب کا ایک مضمون 'غالب انسائیکلو پیڈیا' کے عنوان سے ''پیشوا'' دہلی میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں مرتب کا ایک مضمون 'غالب کی تصویریں' نقوش' لاہور میں بھی چھپا۔ مرتب مدعی ہیں کہ اُن کی فراہم کی ہوئی معلومات کی روشنی میں مرزا غالب کی تصویروں پر بعض شہرت پسندوں نے خامہ فرسائی کی مگر اُن کی سعی نقالی سے آگے نہیں بڑھی۔ روئے سخن کس کی طرف ہے واضح نہیں۔ میری ناقص معلومات کے مطابق ۱۹۴۹ء میں پروفیسر مختار الدین احمد نے غالب نمبر میں غالب کی دو تصویروں کے عکس کے ساتھ اُن کی تصویروں پر ایک نوٹ شائع کیا تھا۔ اور آج کل غالب نمبر ۵۲ء میں موصوف کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا، بعد ازاں ۱۹۵۳ء میں جب انہوں نے ''احوال غالب'' مرتب کی تو اس میں غالب کی تصویروں سے متعلق اپنا ایک مضمون بھی شامل کیا۔ احوال غالب، میں شامل پروفیسر مختار الدین احمد کا مضمون اتنا معلوماتی اور جامع ہے کہ اس پر سرقہ تو کجا استفادے تک کا گمان نہیں گزرتا۔ بہوروی صاحب نے اپنی تحریر کے اختتام پر ایک بار پھر یہ کتاب محمد ابوالحسنات لاری، نعیم اللہ صاحب نورنگری، حاجی شفاعت احمد، گورکھپوری، گن بیر کشور ماتھر دہلوی اور نذیر بنارسی کو نذر کی ہے۔ عرض مرتب کے علاوہ، مالک رام اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی دو تحریریں بھی بالترتیب 'پیش لفظ' اور 'تقریب' کے عنوانوں سے مرقع میں موجود ہیں۔ اس کتاب میں غالب کی کل دس تصویریں شامل ہیں۔

غالب چتر اولی

'غالب چتر اولی' ۱۹۶۰ء میں غالب اکاڈمی، بنارس کی طرف سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ دراصل یہ کتاب مرقع غالب کا ہندی ایڈیشن ہے لیکن بہ ایں صورت مختلف بھی ہے کہ:

(۱) اس میں عبدالرحمٰن چغتائی کی تیار کردہ غالب کی ایک خیالی تصویر کا اضافہ ہے، جسے مصور نے خود 'چتر اولی' کے لیے بھیجا تھا۔

(۲) مرقع غالب کا انتساب بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام ہے جب کہ چتر اولی عزت مآب ڈاکٹر سمپورنا نند کی نذر ہے۔

(۳) چتر اولی کے آغاز میں شامل صدر جمہوریہ ہند راجندر پرساد، وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو، وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنا نند اور وزیر اعظم جموں وکشمیر بخشی غلام محمد اور وزیر برائے تعلیم ہمایوں کبیر وغیرہ کی تصاویر نے جہاں اسے مرقع غالب سے ممیز کیا ہے وہیں اس کی اہمیت وافادیت میں بھی اضافہ کیا ہے۔

(۴) مرقع غالب اور چتر اولی میں بالترتیب 'عرض مرتب' اور 'گزارش' کے عنوانات کے تحت مرتب نے جو دو تعارفی تحریریں شامل کی ہیں وہ لفظاً اور معنیً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

(۵) مرقع کا پیش لفظ مانک رام نے لکھا ہے اور تقریب کے عنوان سے اسی طرح کی ایک تحریر خلیل الرحمٰن اعظمی کے رشحات قلم کی مرہون منت ہے۔ اور چتر اولی میں ہزاری پرساد دویدی، رام دھاری سنگھ دنکر اور ڈاکٹر ہربنش شرما کی تحریریں بہ طور پیش لفظ شامل ہیں۔

(۶) چتر اولی کے آخری صفحات پر آرٹسٹوں اور غالب اکاڈمی کے اراکین کی تصویریں ایک شعر: چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط ÷ بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا۔ کی سرخی کے تحت شامل ہیں۔ چوں کہ پوری کتاب میں مرتب نے عنوانات کے لیے غالب کے اشعار کا ہی انتخاب کیا ہے لہٰذا گمانِ غالب ہے کہ بہوروی مرحوم کے نزدیک شعر مذکورہ بالا بھی غالب ہی کا طبعزاد ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ شعر غالب کا نہیں بلکہ اس کے مصنف منیر شکوہ آبادی کے پوتے عاشق حسین بزم اکبر آبادی ہیں۔ بر بنائے سہو بعض حضرات نے اسے غالب کا شعر تصور کر لیا ہے۔ شعر کی اصل صورت یہ ہے۔

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند + گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا۔

مضامین بہوروی

مرقع غالب اور غالب چتر اولی کے علاوہ غالب اور بنارس کے تعلق سے بہوروی مرحوم کے کُل تین مضامین دستیاب ہوئے ہیں جن میں غالب، تلامذۂ غالب اور بنارس کا ذکر ہے۔

(۱) غالب اور بنارس

ابوالخیر بہوروی کا یہ مضمون نیا دور (لکھنؤ) کے شمارہ اپریل ۱۹۶۴ء کے میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا آغاز ایک مشہور فارسی قطعے کے اس شعر سے ہوتا ہے۔
گفتمش چسیت ؟ ایں بنارس، گفت ÷ شاہدے مست بحوگل چیدن۔ بعدازاں غالب کے اردو اور فارسی کے بعض ایسے اشعار نقل ہیں جن میں ان مقامات کا نام آیا ہے جہاں غالب گئے اور قیام کیا۔ ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے

پیرانہ سال غالب میکش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہ شعر غالب کا طبغراد نہیں بلکہ اس غزل کا مقطع ہے جسے بھوپال کے مولانا محمد ابراہیم خلیل نے خود کہہ کر غالب کے نام سے اپنے اسکول میگزین کے اپریل فول نمبر میں شائع کیا تھا۔ بہوروی مرحوم کے اس مضمون میں میاں دادخاں سیاح کے نام دو خطوں کا ذکر ہے جن میں غالب نے بنارس کی تعریف کی ہے۔ بعدازاں مثنوی چراغِ دیر کا اجمالی تعارف ہدیہ ناظرین کیا گیا ہے۔

مضمون نگار نے غالب کے بنارس پہنچنے کی تاریخ اور قیام کی مدت کے تعین کو "مسئلہ لانیحل" بتایا ہے لیکن جس حویلی میں غالب نے قیام کیا تھا اس کی نشان دہی بڑے وثوق کے ساتھ کی ہے۔ نیز اس کے صدرِ دروازہ کی تصویر مضمون کے ساتھ شائع کی ہے۔ حویلی کے محلِ وقوع کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا گیا ہے۔

"بنارس میں غالب کا قیام مرزا غلام احمد کی حویلی میں تھا۔ یہ در و دیوارِ شکستہ حویلی آج بھی گھوگھرانی گلی میں اپنی عظمت رفتہ کی یادگار ہے۔ گھوگھرانی گلی کا نام "کوچۂ غالب" رکھنے کی تجویز غالب اکاڈمی بنارس نے کارپوریشن کو بھیجی تھی جو منظور ہوگئی ہے۔ گھوگھرانی گلی بنارس کے مشہور بازار دال منڈی میں ہے۔ جہاں کا ہر صغیر و کبیر اپنے پیچھے ایک تاریخ رکھتا ہے۔

بہوروی مرحوم جلت پھرت کے انسان تھے ہی، اختراع کاری اور افسانہ طرازی میں اُن کا ذہن خوب خوب چلتا تھا۔ جھوٹ اور سچ کا فرق ملحوظ رکھنے کی بجائے سچ میں جھوٹ

ملا دینا یا زیب داستان کے لیے کچھ بڑھا دینا اُن کے امتیازات میں شامل تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ غالب نے نہ تو اس حویلی میں قیام کیا تھا، جن کی نشان دہی پیش منظر مضمون میں کی گئی ہے اور نہ ہی کسی ذریعے سے غلام احمد یا ان کے افراد خاندان سے اُن (غالب) کے تعلقات ہی پر روشنی پڑتی ہے۔ خود غالب کے بیان سے اس مفروضے کی تردید ہوتی ہے۔ وہ اپنے خط بہ نام محمد علی خاں صدر امین باندہ، میں بنارس میں اپنے ورود اور قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''...... پنج روز درسرائے نیرنگ آباد کہ در عرف عام بہ سرائے نورنگ آباد، (مشہور است) بے حاصلی گزشت (وبعد ازاں مکانے) در ہماں محلّہ عقب ہماں کارواں سرا پیدا گشت......''

غالب کے اس واضح بیان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھوروی مرحوم کا بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اُن کے اختراعی ذہن کی اپج ہے۔ اسی مضمون میں بھوروی صاحب نے ایک اور بھی انکشاف فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں: غلام قادر صاحب کے پاس 'غنی الطالبین' (غنیۃ الطالبین) کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے، اس کے کئی اوراق پر غالب کے لکھے ہوئے حواشی ہیں، ایک ورق کے خاتمہ پر خرید کردہ شیخ نصیر الدین صاحب ۱۲۷۵ ہجری، محمد اسد اللہ غالب بقلم خاص لکھا ہوا ہے۔

مضمون نگار کا یہ قول بھی صداقت پر مبنی نہیں معلوم ہوتا ہے: کتاب عربی زبان میں ہے اور ایک مذہبی موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ غالب نہ تو عربی کے عالم تھے، نہ ہی مذہب سے انہیں اتنی رغبت تھی کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے اور اس پر حواشی لکھتے۔ راقم الحروف کے خیال میں محمد اسد اللہ غالب، مرزا غالب دہلوی سے بالکل مختلف شخصیت ہیں۔ یہ غالباً الہ آباد کے رہنے والے تھے اور غالب کے شناسا بھی تھے۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے:

''بعد سلام یہ التماس ہے کہ مولوی صاحب عالی شان مفتی اسد اللہ خاں بہادر کی خدمت میں فقیر کا سلام پہنچایئے میں آپ سے......'' (خطوط غالب ص ۸۴۱ جلد دوم مرتبہ خلیق انجم)

اسی طرح کے التباس یا اشتباہ کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ اشہری نے اپنی تصنیف ''ایشیائی شاعری'' میں لکھا ہے کہ:

''مجھ کو دلی کی آبادی اور شاعری کی دنیا میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیکھ لینا اس وقت سے ولی وسودا تک سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے۔ ۱۲۸۵ھ میں، میں نے حضرت مرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا اور اُن کی شیوہ بیانیوں سے مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ کی تھی اور بھوپال میں ملازم تھا۔'' (بحوالہ بھوپال اور غالب ص ۹۹)

مرزا غالب کا ۱۸۲۷ء کے بعد دوبارہ کبھی الہ آباد جانا کسی ذریعے سے ثابت نہیں اور یہ اشہری کی ولادت ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء سے تقریباً چوبیس ۲۴ سال پہلے کی بات ہے۔ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں اُن کی ملاقات جن صاحب سے ہوئی تھی وہ یقیناً مرزا اسد اللہ غالب دہلوی نہ تھے، اُن کے ہم نام یہی مفتی محمد اسد اللہ خاں غالب الہ آبادی تھے جو اس وقت اضلاعِ مشرق ہی میں کسی جگہ صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے۔ بروقتِ ملاقات وہ اپنے وطن الہ آباد آئے ہوں گے (دسنوی صاحب بحیثیتِ غالب شناس مشمولہ عبدالقوی دسنوی ایک مطالعہ ص ۹۸)

(۲) مرزا غالب کے بنارسی تلامذہ

مرزا غالب کے تعلق سے بہوروی مرحوم کا یہ دوسرا مضمون ہے جو نیا دور، لکھنؤ کے ماہ اگست ۱۹۶۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ آغاز مضمون میں مضمون نگار نے اپنی ایک زیر ترتیب کتاب بہ عنوان 'غالب اور بنارس' کا ذکر کیا ہے۔ اس نام کی کوئی کتاب بہوروی مرحوم کے نام سے نہیں ملتی سوائے اس مضمون کے جس پر گذشتہ صفحات میں اجمالی گفتگو کی گئی ہے۔ پیش نظر مضمون، ''مرزا غالب کے بنارسی تلامذہ'' میں چار شاعروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے ان میں پہلا نام اشرف حسین اشرف کا ہے مضمون نگار نے اشرف کے خاندانی حالات تاریخ قصبۂ جائس'' کے حوالے سے بالتفصیل قلم بند کرنے کے بعد غالب سے ان کے تلمذ یا تعلق کی نسبت جو باتیں لکھی ہیں اُن کا استناد محل نظر ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

مولوی عبدالقادر کے دو بیٹے تھے بڑے خادم حسین صدر اعلیٰ اور

چھوٹے محمد حسن منصف تھے۔ان ہی (محمد حسن) کے بیٹے
اشرف حسین تھے جنہوں نے مرزا غالب سے مشورۂ سخن کیا
تھا۔اور ۱۸۲۷ء میں جب مرزا غالب بنارس آئے تھے تو اُن
کے اعزاز میں مشاعرے کی ایک بزم اپنے مکان پرانی عدالت
میں منعقد کی تھی، جس میں عمائدین شہر کے علاوہ نواب صاحب
ٹونک نے بھی شرکت فرمائی تھی جو اپنی ریاست کی کشمکش کی وجہ
سے بنارس میں قیام پذیر تھے۔اُن کے زمانۂ قیام کی یادگار
'ٹونک والی مسجد' مشہور ہے۔اشرف حسین نے جو غزل سنائی
تھی۔اس کا یہ شعر مرزا غالب نے بہت پسند کیا تھا:

ذرہ ہوں بوتراب کی خاک مزار کا
اشرف حسین نام ہے اس خاکسار کا

بھوروی مرحوم کی تحریر کے مطابق اشرف حسین بیٹے تھے محمد حسن کے، جو منصف تھے اور یہ کہ انہوں نے غالب سے مشورۂ سخن کیا تھا۔لیکن نساخ کا بیان اس سلسلے میں مختلف ہے 'سخن شعرا' کی عبارت ملاحظہ ہو: ''اشرف حسین خاں باشندۂ بنارس، شاگرد ہادی علی بے خود، عزیزوں میں خادم حسین خاں اعلیٰ صدرِ امین کان پور کے ہیں'' علاوہ ازیں نساخ نے ایک دوسرے اشرف حسین اشرف کا ذکر کیا ہے انہیں متوطن الہ آباد اور مقیم بنارس عدالت دیوانی شہر بنارس بہ عہدۂ نظارت'' لکھا ہے۔

بھوروی مرحوم کا دوسرا بیان یہ ہے کہ ۱۸۲۷ء میں مرزا غالب کے اعزاز میں پرانی عدالت میں جو بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی اس میں نواب صاحب ٹونک نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ نواب ٹونک یمین الدولہ وزیرالملک محمد علی خاں بہادر صولت جنگ کا بنارس آنا ۱۸۲۷ء کے تقریباً چالیس برس کے بعد کا واقعہ ہے۔

بھوروی مرحوم کا یہ ارشاد کہ اشرف نے جو غزل سنائی تھی اس کا یہ شعر مرزا غالب نے بہت پسند کیا تھا۔

ذرہ ہوں بوتراب کی خاک مزار کا
اشرف حسین نام ہے اس خاکسار کا

دراصل یہ شعر سخنورانِ بنارس، مرتبہ محشر بنارسی (قلمی) میں ترجمہ اشرف میں موجود ہے مگر اس میں اشرف کو شاگرد اسیر لکھا گیا ہے، غالب کی شاگردی کا کوئی ذکر نہیں۔

بھوروی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں! ناموران بنارس کے مصنف نے اشرف حسین کی ایک غزل کے حسبِ ذیل چار اشعار کی نشان دہی کی ہے:

شاہ دلدل سوار کیا کہنا صاحب ذوالفقار کیا کہنا
منفعل نوح کا ہوا طوفان مژۂ اشک بار کیا کہنا
سر نوشتِ جبین عاشق ہے نقش پائے نگار کیا کہنا
رونق محفل عنا دل ہے نور شمع بہار کیا کہنا

چاروں شعر بھی 'سخن ورانِ بنارس' میں موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ناموران بنارس، کا کوئی خارجی وجود نہیں۔ محشر بنارسی کے تذکرے 'سخن ورانِ بنارس' ہی کو ناموران بنارس کا فرضی نام دے دیا گیا ہے۔

رفعت

مرزا غالب کے دوسرے شاگرد جن کا ذکر پیش نظر مقالے میں کیا گیا ہے۔ ابو الفضل محمد عباس رفعت ہیں۔ بھوروی مرحوم نے تلامذہ غالب از مالک رام اور ناموران بنارس کے حوالے سے رفعت کا اجمالی تعارف درج کیا ہے۔ مرحوم کا حاشیہ میں یہ نشان زد کرنا کہ ''تلامذہ غالب کے مرتب نے رفعت کو بھوپالی لکھا'' صحیح نہیں۔ مالک رام نے واضح طور پر لکھا ہے کہ: ''رفعت ۱۲ جولائی ۱۲۴۱ھ (۳۰ مئی ۱۸۲۶ء) کو بنارس میں پیدا ہوئے'' تلامذۂ غالب، طبع دوم ص ۲۱۲۔

عزیز بنارسی

شاگردانِ غالب کے اس سلسلے کا تیسرا نام مرزا یوسف علی خاں عزیز بنارسی کا ہے۔ بھوروی مرحوم نے تلامذۂ غالب نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق اور ناموران بنارس سخنورانِ بنارس کے حوالے سے عزیز اور اُن کے والد کے ساتھ غالب کے اخلاص وارتباط کی وضاحت کی ہے۔ آخر میں عزیز کے نمونۂ کلام کے طور پر مختلف غزلوں کے گیارہ اشعار ناموران بنارس، کے حوالے سے درج کیے گئے ہیں اُن میں آخری دو اشعار کے علاوہ

تمام شعر 'سخنورانِ بنارس' میں موجود ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ محشر صاحب نے پہلے تین شعر عزیز کے کلام میں اور اِن کے بعد کے چھ شعر مرزا محمد صادق طور کے نام سے نقل ہیں۔ ان چھ شعروں میں سے تین شعر ایک ہی غزل سے تعلق رکھتے ہیں جن میں مقطعے کا یہ شعر بھی شامل ہے۔

عجب سرکار ہے اللہ کی اے طورؔ میں صدقے
ہنر مندوں سے پوچھے جاتے ہیں یاں بے ہنر پہلے

آخر میں ایک قطعے کے ۱۳ شعر جو ہیضے کے بیان میں ہیں، نقل کیے گئے ہیں۔ یہ قطعہ اودھ اخبار کے ۱۲ر فروری ۱۸۶۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

بلوان سنگھ

بنارس کے تعلق سے چوتھے شاعر جنھیں بہوروی مرحوم نے اپنے مضمون ''مرزا غالب کے بنارسی تلامذہ'' میں جگہ دی ہے وہ راجا چیت سنگھ کے فرزند ارجمند راجا بلوان سنگھ متخلص بہ راجا ہیں۔ مرحوم نے ناموران بنارس کے حوالے سے راجا بلوان سنگھ کو غالب کا شاگرد لکھا ہے لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ ''اخبار کارنامہ' لکھنؤ میں جتنی غزلیں بلوان سنگھ کی چھپی ہیں اُن کو مرزا حاتم علی مہر کا شاگرد لکھا ہے۔ بایں وجہ غالب کا شاگرد ہونا تحقیق طلب ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ،، ناموران بنارس' دراصل سخنورانِ بنارس' کا فرضی نام ہے اس تذکرے کے مؤلف نے غالب سے راجا کے مشورۂ سخن کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ۔ ''حضرت نظیر اکبرآبادی اور مرزا حاتم علی مہر سے تلمذ تھا۔'' اس لیے بہوروی صاحب کی یہ روایت بھی محض ان کے تخیل کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے۔

خیر بہوروی مرحوم نے ایک اور مضمون غالب کے شاگرد رشید مرزا یوسف علی خاں عزیز بنارسی کے متعلق لکھا ہے۔ جو ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ کے فروری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مرزا غالب کے بنارسی تلامذہ شائع شدہ نیا دور، لکھنؤ ۱۹۶۵ء میں عزیز بنارسی کی سوانح اور شاعری پر ایک مختصر تبصرہ موجود ہے۔ پیش نظر مضمون اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

''آغاز مضمون میں الگ الگ اشخاص کو لکھے گئے مرزا غالب کے خطوط میں سے وہ اقتباسات نقل کیے گئے ہیں جن میں عزیز اوران کے والد نجف علی خاں کا ذکر ہوا ہے اور جن سے ان دونوں کے ساتھ غالب کی محبت و مودت کا اظہار ہوتا ہے۔علاوہ بریں ان تین خطوط کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو مرزا غالب نے عزیز کو لکھے تھے۔

''نادرات غالب'' اور تلامذۂ غالب''اور ناموران بنارس (سخنوران بنارس) کے بیانات کی روشنی میں بہوروی مرحوم نے پہلے مختصراً عزیز کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں بعدازاں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔آخر میں نمونۂ کلام کے طور پر پہلے متفرق غزلوں کے گیارہ شعر درج کیے گئے ہیں جو اس سے قبل ''مرزا غالب کے بنارسی تلامذہ'' میں نقل کیے جاچکے تھے۔اس کے بعد ایک طرحی مشاعرے کی دوغزلیں پیش کی گئی ہیں جو بالترتیب گیارہ اور پندرہ اشعار پر مشتمل ہیں۔یہ دونوں طرحی غزلیں دہلی کے ایک مشاعرے کے لیے ہی کہی گئی تھیں جس کا مصرع طرح تھا۔یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا۔آخر میں ''بیضے کے بیان'' والا وہ مکمل قطعہ نقل کر دیا گیا جس کے تیرہ منتخب شعر تلامذہ والے مضمون میں شامل ہیں۔اس قطعے کے اشعار کی کل تعداد اکتالیس ہے۔یہ قطعہ جن روشن دل وروشن نفس،خانِ والاشان ووالامنزلت کے حسب فرمائش کہا گیا تھا۔ان کا نام انتالیسویں شعر میں اس طرح نظم ہوا ہے۔

میم وحاد (میم و) دال وحاد حسین۔یادنوں سے اسم پاک اس کا ہے بس اس پر بہوروی صاحب نے حاشیہ لکھا ہے کہ ''محمد حسین خان کون تھے، یہ معلوم نہ ہوسکا''

یہ قطعہ ''اودھ اخبار'' کے ۱۲؍فروری ۱۸۲۶ء کے شمارے کے بعد دوبارہ ۱۲؍اگست ۱۸۶۳ کے شمارے میں بھی بہ عنوان ''قطعہ وبائیہ'' شائع ہوا تھا۔اِس شمارے میں درج ذیلی عنوان میں مصنف کے نام اور تلمذ وغیرہ کے علاوہ یہ اطلاع بھی فراہم کی گئی ہے کہ یہ قطعہ ''بذریعہ نامۂ مشفقی مولوی محمد حسین صاحب، مہتمم مطبع مصطفائی واقع دہلی بہ غرض انطباع موصول ہوا تھا۔اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محمد حسین خاں سے یہی مولوی محمد حسین مہتمم مطبع مصطفائی مراد ہیں۔''(مرزا یوسف علی خاں عزیز شاگرد غالب کا نایاب کلام از اکبر حیدری فروری ۱۹۷۲ء۔ماہنامہ شاعر ص ۴۱۔)

سید حسن عباس

بنارس ہندو یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں موجود آثار غالب کے قلمی نسخے

نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی (۱۲۱۲ھ۔۱۲۸۵ھ) کا شمار اردو اور فارسی کے طراز اول کے شعرا و ادبا میں ہوتا ہے۔ اُن کا کلام ہماری زبان کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ انہیں نابغۂ روزگار اور ہندوستانی فارسی کی روایت کا امین وعلمبردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی نظم ونثر میں گراں قدر ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے جو تقریباً تمام اصناف پر حاوی ہے۔ یہ بھی مشہور اور حقیقت ہے کہ وہ اردو سے زیادہ اپنی فارسی شاعری کو اہمیت دیتے تھے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اُن کی تمام تر شہرت ومقبولیت کا دارومدار اُسی اردو شاعری پر ہے جسے وہ حقیر اور کمتر سمجھتے تھے۔ لیکن انہیں دونوں ہی زبانوں پر اپنی قدرت وتسلط اور دونوں زبانوں کے شعر وادب میں اپنے کارناموں کا بخوبی احساس بھی تھا۔ اسی لیے جگہ جگہ اردو اور فارسی اشعار میں اس کی طرف اشارے بھی کیے ہیں:

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب! مرے اشعار میں آوے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب! صریر خامہ نوائے سروش ہے
غالب مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو — پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

اسی سلسلے کے چند فارسی اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے:

درتہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ ای — تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
من آن کسم کہ بہ توقیع مبدء فیاض — شہ قلمروِ نظم درین جہانِ خراب
ہمی کنم بہ قلم کارِ تیغ واین کاریست — شگرف ونغز و دپسندیدۂ اولوالالباب
سلجو قیم بہ گوہر دخاقا نیم بہ فن — توقیع من بہ سنجر و خاقان برابراست

غرض میرزا کی شعری وادبی اہمیت کے بارے میں جس قدر کہا جائے کم ہوگا۔
غالب کے سوانح نگاروں اور غالب شناسوں کا خیال ہے کہ غالب پنشن کے سلسلے میں اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس کے سرائے نورنگ میں ٹھہرے تھے اُس وقت ان کی عمر انتیس برس تین ماہ تھی۔ انہوں نے بنارس کی جو تعریف اپنے خطوں میں کی ہے وہ قابل توجہ ہے۔ اسی طرح ان کی مثنوی 'چراغ دیر' ایک تحیر آفریں مثنوی ہے جو اُن کی فنکاری کا ایک شاہکار ہے۔

''سحر گاہان (بر ساحل گنگ) رسیدہ' زود' چون باداز آب گزشتم' وبہ پای شوق سوی بنارس' گرم پو یہ گشتم' روزِ ورودِ بنارس بادی جانفزا' وسیمی ...... آسا' از جہتِ مشرق وزید وجانم ر' تواں ودلم' اروان بخشید. اعجازِ آن مُشتِ ہوا غبارم را' چون علم فتح برافراشت داہتزازِ آن نسیم' اثرِ ضعف درمن نگذاشت. خوشا سوادِ بنارس کہ اگراز فرطِ دلنشینی' سویدای عالمش خوانم بجاست' وحبذا اطرافِ آن معمورہ کہ اگر از جوشِ سبزہ وگل' بہشتِ روی زمینش' دانم' رواست. ہوایش خدمتِ جان درکالبدِ اموات دمید نوہ ذرہ ذرۂ خاکش راچون جوہر آہن ربا منصبِ پیکانِ خار، از پای رہ روان کشیدن گنگ اگر سر بپایش نسودی، درنظرِ مااین قدر گرامی نبودی وخورشید اگر بردیوار ودرش نگزشتی (بدیگونہ، فروزان) وتابناک نگشتی بغرض (کذا) روانی بحر طوفان خروش گنگش، خانۂ ساکنان ملاء اعلیٰ، سیلابی است وبہ جلوہ گاہِ پری چہرگان (سبزہ رنگ)، کتان خانہ ہای قدسیان ماہتابی. اگراز کثرتِ عمارت، قاف تا قافش سخن رانم

سراسر دیر سا رمستان است واگراز...... سبزہ وگل اطرافش فصلی فروخوانم ،بیابان در بیابان، بہارستان۔

تعالی اللہ بنارس چشم بددور (بہشت خرم) و فردوس معمور
خس وخارش گلستان است گویی غبارش جوہر جان است گویی
سروش پای تخت بُت پرستان سراپا لیش زیارت گاہ مستان
بنارس راکسی گفتہ کہ چین است ز موجِ گنگ چینش بر جبین است
بخوش پرکاری طرز وجودش زدہلی می رسد ہر دم درودش
بنارس راتو گوئی دید در خواب کہ می گردو زنہرش در دھن آب
حسودش گفتن آئین ادب نیست ولیکن غبطہ گر باشد عجب نیست
فرنگستانِ حسن بی نقاب است ز خاکش ذرہ ذرہ آفتاب است
بُتانش راہیولیٰ شعلۂ طور سراپا نور ایزد چشم بددور
میا نہا نازک و دلہا توانا ز نادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ در دلھا طبیعی است دھن ہا اشک گلہای ربیعی است

(''صبح سویرے میں گنگا کے ساحل پر پہنچا۔ ہوا کی طرح سے پانی پر سے گزرتے ہوئے بنارس کی جانب پورے جوش وخروش سے روانہ ہوا۔ جس روز بنارس پہنچا مشرق سے چلنے والی ہوائے جانفزا جان ودل کو توانائی اور تازگی بخش رہی تھی۔ اس ہَوا کے اعجاز نے میرے غبار کو پرچم فتح کی مانند بلند کردیا اور اس کے اثر نے میری تکان دور کردیا۔ خوش بحال شہر بنارس۔ اگر اس کی دل نشینی کے سبب اسے سویدائے عالم کہوں تو بجا ہے۔ مرحبا! اس شہر کے اطراف میں سبزہ وگل کی ایسی کثرت ہے کہ اگر اسے روئے زمین پر بہشت سے تعبیر کروں تو روا ہے۔ اس کی ہَوا مردہ جسموں میں روح پھونک رہی ہے۔ اس کا ذرہ ذرہ مسافر کے پاؤں سے مقناطیس کی طرح کانٹے چن رہا ہے۔ اگر گنگا اس کے قدموں پر سر نہ رکھتی تو ہماری نظر میں اتنی محترم نہ ہوتی۔ اگر سورج اس کے درودیوار سے نہ گزرتا تو اتنا روشن وتابناک نہ ہوتا۔ اس کے گنگا موجیں مارتی لہریں آسمان کو چھوتی ہیں، یہ ملاء اعلیٰ کے ساکنین کا گھر ہے۔ سبزہ رنگ پری چہرہ حسینوں کی جلوہ گاہ کے مقابلے میں قدسیان ماہتابی

کے گھر کتان کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس شہر کی عمارتوں کی کثرت کا ذکر کروں تو وہ سراسر مستوں کی یاد دلاتے ہیں اور اگر اس شہر کے اطراف سبزہ وگل کا بیان کروں تو دور دور تک بہارستان نظر آئے'')

غرض میرزا کی عظمت کے بارے میں' اُن کے طرز نگارش اور فکر وخیال کی بابت اب تک جتنا لکھا گیا ہے وہ کم ہی کسی کے حصے میں آیا ہوگا۔ ان کی اردو فارسی کی تصانیف بھی کم نہیں ہیں اور یہ کسی بھی کتب خانے کی زینت کا سبب بن سکتی ہیں۔ اُن کی تمام تصانیف زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر اہل علم اور شائقین شعروادب کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں اور وہ میرزا غالب کے اعجازِ فکر وسخن سے لطف وانبساط حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی مستقل کتاب میں اُن کی اردو فارسی کی تصانیف کے قلمی نسخوں کی فہرست سازی اور ان کے محتویات کے مطابق، میرزا کی فارسی تصانیف پر تحقیقی کام ہونا باقی ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

جہاں تک آثارِ غالب کے مخطوطات کا سوال ہے جستہ جستہ ایسے قلمی نسخے سامنے آتے رہے ہیں جنھوں نے غالب شناسوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے ممکنہ حد تک تحقیق وتنقید کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری کے ذخیرۂ لالہ سری رام میں بھی آثارِ غالب کے چند قلمی نسخے محفوظ ہیں جن میں اُن کی مشہور فارسی مثنوی 'ابر گہربار' کا ایک نسخہ ہے جو اُن کی فارسی مثنویوں میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح اُن کی فارسی نثر کی سب سے اہم تصنیف 'پنج آہنگ' کے چار قلمی نسخے یہاں ملتے ہیں پنج آہنگ کو میرزا غالب، ''گفتارِ فارسی را قانونی است خرد پسند'' سمجھتے تھے۔ ہر قلمی ذخیرے میں ایسے کچھ نسخے ضرور مل جاتے ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ذخیرۂ بنارس میں بھی ایسے نسخے موجود ہیں۔ جن میں چند بیش قیمت اور نادر مخطوطے، معروف محقق اور غالب شناس پروفیسر حنیف نقوی (سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) کی توجہ سے متعارف ہو چکے ہیں۔ پنج آہنگ کے اِن نسخوں میں وہ قدیم ترین مخطوطہ بھی شامل ہے جسے موصوف نے ''کسی تردد کے بغیر پنج آہنگ' کا اولین یا قدیم ترین نسخہ قرار دیا'' ہے۔ ۱۹۹۷ء

میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے اس کی عکسی اشاعت عمل میں آئی تھی۔اس نادر نسخے کے علاوہ تین دیگر نسخے بھی یہاں موجود ہیں جن میں ایک ایک مطبوعہ نسخے کی نقل ہے۔اور ناقص بھی ہے۔یہ ۴۲صفحات پر مشتمل ہے۔کاتب اور تاریخ کتابت کا ذکر نہیں۔اس کا آغاز' نواب حشمت جنگ بہادر...... کے نام کے مکتوب سے ہوتا ہے اور خاتمہ آغا محمد حسین ناخدای شیرازی کے نام کے خط پر۔اس کے صفحات جگہ جگہ سے چپک گئے ہیں اور کئی جگہ سے اس کے صفحات کٹے پھٹے ہوئے ہیں۔اس میں خاتمے کی وہی عبارت ہے جو مطبوعہ نسخے میں ملتی ہے۔

پنج آہنگ کا دوسرا اہم نسخہ جس کا مسلسل نمبر ۶۷۹ ہے، بخط نستعلیق صاف وخوانا ہے۔یہ مجلد ہے اور اس کا کاغذ مضبوط دیسی کاغذ ہے۔اس کے کاتب کا نام گنگا پرشاد اور تاریخ کتابت ۴ رجب ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء نیز ۵ جلوسِ بہادر شاہ بادشاہ غازی ہے۔صفحات کی تعداد ۱۷۲ اور ہر صفحہ ۱۳ سطری ہے۔سائز ساڑھے چودہ گنا ساڑھے اکیس سنٹی میٹر۔پورے نسخے میں سرخ اور نیلی روشنائی سے جدولیں بنی ہیں۔عناوین سرخ ہیں۔یہ نسخہ نواب محمد شمس الدین حسین خان کی فرمائش پر شاجہاں آباد میں تیار ہوا ہے ۔صفحات ۴۔۵۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۰۔۱۱۔۱۲۔۱۳۔۱۴۔۱۵۔اور ۱۶ کے حاشیے پر' گرہ' کی ردیف میں غالبؔ اور ذوقؔ کے فارسی قصیدے' متن سے مختلف خط میں درج ہیں۔دونوں قصیدے کے مطلعے درج ذیل ہیں۔

غالب: ردیف شعر ازان کردم اختیار گرہ
که ازمن است برابروی شهر یار گرہ
ذوقؔ: چنان بجا طرم افگندہ روزگار گرہ
کہ اوفتاد بہ تارِ نفس ہزار گرہ

نسخے کے مطابق غالبؔ کے قصیدے میں ۴۰ اور ذوقؔ کے قصیدے میں ۱۳۳ اشعار ہیں۔

آغاز: ''بعد تقدیم نیایش دادار جہان آفرین وتمہید ستایش حضرت سید المرسلین ودریوزہ ہمت از نفوس قدسیہ بزرگان دین می گوید ذرۂ ناتوان وخاکسار ہیچمدان علی بخش خان ابن الہی بخش

خاں مغفور کہ در ایامی کہ بہ گوشہ بساط قرب عم مرحوم فخر الدولہ
دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ......"

نسخے کا ترقیمہ حسب ذیل ہے:

''تمام شد نسخہ متبرکہ موسوم بہ پنج آہنگ بتاریخ چہارم ماہ رجب
المرجب ۵ سنہ جلوس میمنت مانوس، بادشاہِ جم جاہ، ثریاً بار
گاہ، بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ الملکہ مطابق سنہ یکہزار (و)
دو صد (و) پنجاہ ہفت ہجری مقدسہ نبوی علیہ التحیہ والثنا بہ یدِ
اضعف العباد گنگا پرشاد بہ موجب فرمایش نواب صاحب والا
مناقب انور الدولہ محمد شمس الدین حسین خاں بہادر دامت برکاتہ
وضاعف حسناتہ بہ مقام بلدۂ شاہ جہان آباد صانہا اللہ تعالیٰ عن
الشر والنقصان'' (ص ۲۶۹۔۲۶۸)

پانچ آہنگوں پر مشتمل اس کے ابواب کی تفصیل یوں ہے:

آہنگ اول: نثر ہای داخل دیوان کرامت نشان
آہنگ دوم: نثر ہای خارج دیوان
آہنگ سوم: القاب وآداب ومراتبِ متعلقۂ آن
آہنگ چہارم: اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشک گلستان کہ در مکاتیات بکار آید۔
آہنگ پنجم: مصادر ومصطلحات ولغات فارسی

آہنگ اول میں جو تحریریں شامل ہیں ان میں۔ دیباچہ دیوان فارسی۔ دیباچہ گل رعنا۔ دیباچہ دیوان ریختہ۔ نامہ بنام نامی نواب سید علی اکبر خاں متولی امام باڑہ ہوگلی بندر۔ خاتمہ گل رعنا۔ ترتیب دیوان فارسی۔ اور خاتمۂ دیوان فارسی ہیں

اس نسخے کے آہنگ اول اور 'نسخۂ بنارس مطبوعہ' (عکسی ایڈیشن ۱۹۹۷ پٹنہ) کے آہنگ اول کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے ایک معمولی فرق کے۔ نسخۂ بنارس مطبوعہ میں شامل آہنگ اول کے چھٹے مطلب 'ترتیب دیوان فارسی' کے شروع میں 'خاتمہ عبارت وباعث' کا ٹکڑا ہے جبکہ زیر بحث نسخے میں صرف 'ترتیب دیوان فارسی' کی عبارت

ملتی ہے بقیہ مشمولاتِ آہنگ اول، دونوں نسخوں میں یکساں ہیں۔

آہنگ دوم جو 'نثرہای خارج از دیوان' پر مشتمل ہے دونوں نسخوں میں یعنی نسخہ بنارس مطبوعہ اور زیر بحث نسخے میں 'مختلف صورتوں میں ضبط تحریر میں آیا ہے۔ نسخہ بنارس مطبوعہ میں صرف ۱۹ اور زیر تعارف نسخے میں ستاون خطوط اور عرضداشتیں وغیرہ شامل ہیں۔ مطبوعہ نسخے کے آہنگ دوم کا آخری خط 'بہ الف بیگ نام دوستی در باب تسمیۂ پسرش' ہے جبکہ زیر بحث نسخے میں اس کے بعد بھی خطوط اور تحریریں شامل ہیں جن کی ترتیب نولکشوری ایڈیشن سے مختلف ہے۔ اس نسخے کے اس آہنگ میں شامل خطوط کی فہرست درج ذیل ہے۔

۔مکتوب باسم سامی سبحان علی خاں (ص ۸۷)

۔خط بہ شیخ امام بخش ناسخ (ص ۸۹)

۔خط بہ مولوی نور الحسین (۹۲)

۔نامہ بنام مولوی محمد فضل حق صاحب (۹۸)

۔جواب مصطفیٰ خان بہادر (۱۰۰)

۔عرضداشت بحضور شاہ اوداز جانب مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خان بہادر (۱۰۲)

۔خط بنام مولوی سراج الدین احمد (۱۰۳)

۔خط بنام نواب مصطفیٰ خان بہادر (۱۰۵)

۔نامہ بنام مولوی سید ولایت حسین خان بہادر بہ پوزش جرم کاہل قلمی و مبارکباد حصول منصب قاضی القضائی (۱۶)

۔سواد رقعہ موسومہ مولوی محمد صدر الدین خان بہادر صدر الصدور (۱۰۹)

۔نامہ بہ دوستی در رسید مکتوب (۱۱۰)

۔نامہ بنام نامی مومن خاں صاحب سلمہ اللہ تعالی (۱۱۲۔۱۱۳)

۔نامہ بہ نواب مصطفیٰ خاں در صنعت یکرنگی زبان یعنی پارسی بی آمیزش لفظ عربی (۱۱۴)

۔ایضاً (۱۱۵)

۔ایضاً (۱۱۷)

۔آرائش گفتار در ظہور ہوا و نموداری صبح بفرمایش نواب غلام حسین خان بہادر (۱۱۹)

۔سخن در ہجوم ظلمت شب بفرمان نواب غلام حسین خان بہادر (۱۲۱)

۔بہ مولوی سید ولایت حسین (۱۲۴)

۔خط بنام مولوی سراج الدین احمد (۱۲۴)

۔[خطوط بنام سراج الدین احمد] ۱۲۵۔۱۶۰] (۲۶ خطوط)

۔خط بجواب خط میجر جان کوب صاحب بہادر (۱۶۱)

۔تقریظ دیوان حافظ رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۲)

۔بہ نواب مصطفیٰ خاں بہادر (۱۶۸)

۔خط بہ میاں نوروز علی خاں بہادر مشعر ارسال مجموعہ نثر بہ اظہار محبت غایبانہ (۱۷۰)

۔ایضاً بہ میاں نوروز علی خاں مشتمل بر اطلاع روانگی پنج آہنگ (۱۷۲)

۔امین الدولہ آغا علی خاں بہادر (۱۷۴)

نامہ بنام نامی میر سید علی خاں بہادر عرف حضرت جی (۱۷۷)

۔میجر جان کوب صاحب بہادر (۱۸۰)

۔مولوی سراج الدین احمد (۱۸۱)

نامہ مولوی سید ولایت حسن خاں بہادر قاضی القضات (۱۸۸)

مولوی سراج الدین احمد (۱۹۰۔۱۹۲)

اس نسخہ کا آہنگ سوم، در آداب والقاب وشکوہ (کذا=شکر) وشکوہ وما تیعلق بھا، (ص ۱۹۳) ہے

آہنگ چہارم۔ مشتمل بر اشعار مکتوب ومنتخب از دیوان کہ در مکاتبات بکار آید واقسام نثر را آرایش دھد' (ص ۲۲۴) ہے۔

آہنگ پنجم: مصادر ومصطلحات ولغات فارسی پر مشتمل ہے جس میں پانچ 'زمزمے' ہیں: (ص ۲۴۱۔۲۶۸)

نخستین زمزمہ بہ دیباچگی این آہنگ روشناس

دومین زمزمہ بہ نکاتی کہ حقیقت مصادر از ان بی پردہ گردد

سویمین زمزمہ بہ شمار مصادر فارسی مرغولہ ریز

چارمین زمزمہ در مصطلحات

پنجمین زمزمہ در لغات

یہ نسخہ اس شعر پر تمام ہوتا ہے۔

می زند دم زفنا غالب و تسکینش نیست
بو کہ توفیق زگفتار بہ کردار بَرد (ص ۲۷۸)

اس نسخے کے آخری دو صفحات پر یعنی ص ۲۷۰۔۲۷۱ پر ایک قصیدہ:

خورشید بہ بیت الشرف خویش در آمد

کے ۴۵ اشعار نقل ہوئے ہیں۔

پنج آہنگ کا ایک اور نسخہ یہاں ملتا ہے جس کا مسلسل نمبر ۶۸۰ ہے یہ بڑے سائز کا مجلد نسخہ باریک چکنے کاغذ پر صاف ستھرے نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت موجود نہیں ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۷۸ ہے ہر صفحہ ۱۵ سطری ہے۔ عنوانات سرخ ہیں۔ نسخہ ظاہری طور پر بہت اچھا ہے۔ اس کے ابواب کی ترتیب اس طرح ہے جو سابق الذکر نسخے سے مختلف ہے۔

آہنگ اول: القاب و آداب و مراتب متعلقہ آن (ص ۲۔۱۷ب)

آہنگ دویم: مصادر و مصطلحات و لغات فارسی

آہنگ سیوم: اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشک گلستان کہ در مکاتبات بکار آید۔ (۳۴ب۔۴۳الف)

آہنگ چہارم: خطبِ کتب و تقاریظ و عبارات متفرقہ (۴۳الف۔۴۷ب)

آہنگ پنجم: مکاتبات (۴۷ب۔۱۷۳الف)

اس نسخے میں ورق ۱۷۵ب کے بعد پانچ اوراق سادہ ہیں۔ اس کے بعد ۱۷۶ الف پر فیضی کی موارد الکلم کی تقریظ در مدحِ تعطیل، اسی ورق کے آخر سے 'دیباچہ دیوان منشی ہر گوپال تفتہ' شروع ہو کر ۱۷۷الف پر تمام ہوتا ہے۔ وہاں سے 'تقریظِ آثار الصنادید' شروع ہوتی ہے جو ۱۷۸الف پر تمام ہوتی ہے۔ نسخہ بھی یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ اس

کے بعد کے ایک صفحے پر غالب کی مشہور نعت:

آری کلام حق بزبان محمدؐ است۔

اور مشہور مثنوی رای شہنشاہ آسمان اورنگ + ای جہاندارِ آفتاب آثار= نقل ہوئی ہے۔ نعت کے ۱۱ شعر اور مثنوی میں ۱۳۰ اشعار آئے ہیں۔ یہ کسی اور کاتب کی لکھی ہوئی ہیں۔

مذکورہ نسخے کے ورق ۱۷۴ الف تا ۱۸۹ الف کے حاشیے پر بھی دوسرے کاتب کے خط میں 'تقریظ مواد رالکلم' دیباچہ دیوانِ تفتہ' تقریظ آثار الصنادید' دیباچہ دیوان ریختہ' دیباچہ تذکرہ موسوم بہ طلسم راز فراہم آوردہ میر مہدی' وغیرہ لکھے گئے ہیں۔

اس نسخے کے آہنگ دوم میں تحریر ہے کہ 'وازین آہنگ چار زمزمہ می خیزد' جبکہ بقیہ نسخوں میں یہ حصہ آہنگ پنجم کا حصہ ہے اور 'پانچ زمزموں' پر مشتمل ہے۔ اس نسخے میں چار ہی زمزمے ہیں۔

نخستین زمزمہ: بہ نکاتی کہ حقیقت مصادر راز ان بی پردہ گردو مشتمل؟

دومین زمزمہ: بہ شمار مصادر فارسی مرغولہ ریز

سومین زمزمہ: مصطلحات

چارمین زمزمہ: درلغات

اسی طرح آہنگ چہارم 'خطب کتب وتقاریظ وعبارت متفرقہ' پر مشتمل ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۔ دیباچہ دیوان فارسی (۴۳ الف)

آغاز ۔ وہی

انجام ۔ درتۃ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ ای

تازدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

۔ دیباچہ گل رعنا (۵۲ الف)

۔ دیباچہ دیوان ریختہ (۵۵ الف)

۔ خاتمہ گل رعنا (۵۶ الف)

۔ خاتمہ دیوان فارسی (۶۱ ب) آغاز ۔ وہی

انجام۔رباعی: گر ذوق سخن بہ دھر آئین بودی
اشعار مرا شہرت پروین بودی

غالب اگر این فن سخن دین بودی
آن دین را ایزدی کتاب این بودی

۔تقریظ تذکرہ اردو تالیف نواب مصطفیٰ خان بہادر (۶۳ ب)
۔نثری کہ بعنوان قصیدہ مدح مسترماندک صاحب سکتر اعظم نواب گورنر جنرل بہادر رقم فرمودہ اند (۶۶ الف)
۔نثری کہ بر پشت دیوان ریختہ رقم نمودہ بہ شیخ امام بخش ناسخ فرستادہ شد
۔آرایش گفتار در ظہور ہور و نموداری صبح
۔سخن در ہجوم ظلمت شب
۔ہذا التقریظ دیوان خواجہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ
۔عبادت در صنعت مقطع الحروف
۔دیباچہ دیوان مرزا رحیم الدین بہادر (۷۲ ب)

'آہنگ پنجم' میں درج ذیل لوگوں کے نام کے خطوط یا عرضداشتیں ملتی ہیں۔

۱۔نامہ بنام نامی نواب سید علی اکبر خان متولی امام باڑہ ہوگلی بندر
۲۔خطی کہ در تہنیت شادی منشی احمد حسن بہ منشی محمد حسن نگاشتہ اند
۳۔نامہ کہ از دہلی بنام مرزا علی بخش خان بہادر رقم شد
۴۔ایضاً بنام مرزا علی بخش خان بہادر
۵۔ایضاً بنام علی بخش خان بہادر از کلکتہ 'روائی' یافت۔
۶۔ایضاً از کلکتہ بہ جامع نسخہ
۷۔رقعہ بنام نامی مولوی صاحب والا مناقب مولوی محمد صدر الدین خان بہادر
۸۔مکاتبہ در جواب خط نواب مصطفیٰ خان بہادر
۹۔خط بنام میر اعظم علی مدرس مدرسۂ اکبر آباد

۱۰۔ خط بہ مولوی کرم حسین خان سفیر شاہ اود
۱۱۔ مکتوب بنام سبحان علی خان
۱۲۔ رقعہ بنام نامی نواب مصطفیٰ خان بہادر
۱۳۔ نامہ باسم سامی نواب اکبر علی خان متولی امام باڑہ ہوگلی بندر
۱۴۔ خط بہ شیخ امام بخش ناسخ
۱۵۔ عرضداشت بجواب شقہ صاحب عالم مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر
۱۶۔ رقعہ بنام نواب مصطفیٰ خان بہادر
۱۷۔ رقعہ بنام حکیم احسن اللہ خان
۱۸۔ بہ الف بیگ نام دوستی در باب تسمیۂ پسرش
۱۹۔ مکتوب بہ اسم سامی سبحان علی خان
۲۰۔ خط بہ شیخ امام بخش ناسخ
۲۱۔ خط بہ مولوی نور الحسین
۲۲۔ نامہ بنام مولوی حافظ محمد فضل حق صاحب
۲۳۔ بہ نواب مصطفیٰ خان بہادر
۲۴۔ عرضداشت بحضور شاہ اود محمد علی شاہ از جانب مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خان بہادر
۲۵۔ خط بنام مولوی سراج الدین احمد
۲۶۔ خط بنام نواب مصطفیٰ خان بہادر
۲۷۔ نامہ بنام نامی سید ولایت حسین خان بہادر بپوزش جرم کاہلی قلمی و مبارک باد حصول منصب قاضی القضاتی
۲۸۔ سواد رقعہ موسومۂ مولوی محمد صدر الدین خان بہادر صدر الصدور
۲۹۔ نامہ بنام شیخ امیر اللہ سرور تخلص
۳۰۔ نامہ بنام مومن خان صاحب سلمہ اللہ تعالی
۳۱۔ نامہ بنام مصطفیٰ خان بہادر در صنعت یکرنگی زبان یعنی پارسی بی آمیزش عربی

۳۲۔ایضاً

۳۳۔ایضاً

۳۴۔نامہ بنام مولوی سید ولایت حسین

۳۵۔خط بنام مولوی سراج الدین احمد

۳۶۔۶۱۔ایضاً

۶۲۔خط بجواب خط میجر جان کوب صاحب بہادر

۶۳۔بہ نواب مصطفیٰ خان بہادر

۶۴۔خط بہ میاں نوروز علی خاں بہادر مشتملبر روانگی پنج آہنگ

۶۶۔بہ امین الدولہ آغا علی خاں بہادر

۶۷۔نامہ بہ نام نامی جناب میر سید علی خاں بہادر عرف حضرت جی

۶۸۔خط بنام میجر جان جاکوب صاحب بہادر

۶۹۔مولوی سراج الدین احمد

۷۰۔بنام مولوی سید ولایت حسن خاں بہادر

۷۱۔نامہ بہ مولوی سراج الدین احمد

۷۲۔رقعہ بخدمت مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خان بہادر حسام جنگ

۷۳۔ایضاً بہ مبارز الدولہ بہادر

۷۴۔رقعہ بخدمت معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر خاں بہادر عرف حسین مرزا

۷۵۔بہ منشی التفات حسین خان

۷۶۔بہ منشی محمد حسن صاحب

۷۷۔ایضاً بہ منشی محمد حسن صاحب

۷۸۔ایضاً

۷۹۔خط بنام مولوی محمد علی خان صدر امین باندا بوندیل کھنڈ

۸۰۔۸۶۔ایضاً

۸۷۔بہ میاں محمد نجف صاحب

۱۱۹۔ خط بہ مظفر حسین خان

۱۲۰۔ در تہنیت گورنری اکبر آباد بہ جیمس تامسن صاحب بہادر نوشتہ شدہ است۔

۱۲۱۔۱۲۲۔ خط بنام امیر حسن خاں

آخری دو خطوط ۱۷۳ ب تا ۱۷۵ الف پر الحاقی صفحات پر درج ہیں ان کا کاتب بھی کوئی اور ہے۔ مذکورہ بالا خطوط پر علاحدہ سے نمبر شمار بھی لکھے گئے ہیں جو ترتیب سے نہیں ہیں۔

اس نسخے کا آہنگ پنجم' جو خطوط پر مشتمل ہے' اس کا سب سے بڑا حصہ ہے اس میں ۱۲۲ خطوط وغیرہ نقل ہوئے ہیں۔ جن میں پروفیسر حنیف نقوی صاحب کی تحقیق کے مطابق ۱۱۸ خطوط' پنج آہنگ کے تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہیں باقی چار خطوط کسی دوسری جگہ نہیں ملتے''۔[۱] یہ چار خطوط جنھیں تھامسن' نواب مظفر الدولہ مرزا سیف الدین حیدر خاں بہادر سیف جنگ اور نواب معین الدولہ مرزا ذوالفقار الدین حیدر خاں بہادر ذوالفقار جنگ کے نام ہیں۔ موخر الذکر کے نام دو خط ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نسخے پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے پروفیسر حنیف نقوی صاحب نے داخلی شہادتوں کی بنا پر اس اہم نسخے کا سال کتابت بھی طے کر دیا ہے جو اُن ہی جیسے صاحب تحقیق سے ممکن بھی ہے بلکہ یہ کہوں تو نامناسب نہ ہوگا کہ

این کار از تو آید و مرداں چنین کنند

وہ لکھتے ہیں:

مطبع سید الاخبار کے......اعلان اشاعت (پنج آہنگ) اور مطبع شاہی سے اشاعت اول (اگست ۱۸۴۹ء) کے درمیانی عرصے میں بھی شائقین کی طرف سے 'پنج آہنگ' کی طلب اور اس کی نقلوں کی تیاری کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اس کے قلمی نسخوں میں سے ایک نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے (مسلسل نمبر ۶۸۰) میں موجود ہے۔ آخر میں کوئی ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نسخے کا سال کتابت متعین طور پر معلوم نہیں۔ تاہم داخلی شہادتوں کی بنیاد پر 'در تہنیت گورنری اکبر آباد' بہ جیمس تامسن صاحب بہادر (شمارۂ خط ۱۰۹) ہے۔ چوں کہ جیمس تامسن ۹ نومبر ۱۸۴۳ء کو صوبہ شمال مغربی کے گورنر مقرر ہوئے تھے

اس لیے یہ خط یقینی طور پر اس ماہ کے اواخر یا دسمبر ۱۸۴۳ء کے شروع میں لکھا گیا ہوگا اور زیر بحث نسخے کی کتابت اسی کے آس پاس، زیادہ سے زیادہ ۱۸۴۴ء کے اوائل میں مکمل ہوئی ہوگی۔"[۲۴]

اس کے علاوہ اس نسخے کے چند مزایا اور بھی ہیں جیسے تقریظ موارد الکلم اواسط محرم ۱۲۵۶ھ میں لکھی گئی ہے (۱۴۹)' دیباچۂ دیوان مرزا رحیم الدین حیا' بعہد بہادر شاہ یعنی بعد از ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء، مطابق ۲۹ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ' مکتوب بنام امیر حسن خاں مورخہ ۲۲ جولائی ۱۸۴۴ء، اس مخطوطے میں شامل نہیں تھا۔ جس نے یہ خط نسخے کے آخر میں اضافہ کیا ہے۔ اُسی نے حاشیوں پر بھی اضافے کیے ہیں۔ یہ اضافہ جولائی ۱۸۴۴ء کے بعد ہوئے ہیں۔ آہنگ چہارم بخط فقیر صاحب اور مولچند ہے۔ فقیر، غالب کے شاگرد تھے۔

اس نسخے کی اہمیت ایک اعتبار سے اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے بالکل آخری صفحے پر کسی اور کاتب نے غالب کی مشہور نعت:

حق جلوہ گر زطرز بیان محمدؐ است

آری کلام حق بہ زبان محمدؐ است

کے گیارہ اشعار نقل کیے ہیں جبکہ متداول دیوان میں اس نعت شریف میں نو اشعار ہی ملتے ہیں۔ جو دو دیگر اشعار اس نسخے میں ضبط تحریر میں آئے ہیں وہ یہ ہیں:

گفتی ہمی ز آتش دوزخ جہد شرار　　آن برق لمعۂ زسنان محمدؐ است

گفتی ہمی بہ گلشن جنت وزد نسیم　　آن موج جنبشی زعنان محمدؐ است

اس نعت کا پانچواں شعر 'ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد' اسی طرح' دیوان میں ضبط ہوا ہے جبکہ مذکورہ قلمی نسخے میں 'بدانچہ' کی جگہ 'بہ ہر چہ' ضبط ہوا ہے یعنی:

ہر کس قسم ''بہ ہر چہ'' عزیز است می خورد

ذخیرہ بنارس میں موجود غالب کی مشہور مثنوی 'ابر گہر بار' کا بھی ایک نسخہ ہے یہ مثنوی جیسا کہ آپ سب واقف ہیں مناجات' حکایت' نعت' بیان معراج' منقبت' مغنی نامہ اور ساقی پر مشتمل گیارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ زیر گفتگو نسخہ' صاف نستعلیق خط میں اور باریک چکنے مگر مضبوط کاغذ پر لکھا گیا ہے لیکن کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ صفحات

کی تعداد ۷۶ اور ہر صفحہ پہلے اور آخری صفحے کو چھوڑ کر ۱۵ سطری ہے۔ کہیں کوئی عنوان بھی درج نہیں ہے۔ غالب کی یہ مثنوی نہ صرف یہ کہ ان کی سب سے طویل مثنوی ہے بلکہ موضوع کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ 'غزوات پیغمبر' نظم کرنا چاہتے تھے لیکن آگے چل کر اسے نامکمل چھوڑ دیا اور یہ جواز پیش کیا کہ "اس داستان کے نظم نہ کرنے کی ایک عام وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے شہری و دیہاتی ' دانا اور نادان اور بوڑھا اور جوان۔ شاید ہی کوئی ہو جس اس سے واقف نہ ہو۔"

انہوں نے اس میں حمد' مناجات، نعت، بیان معراج اور منقبت جیسے موضوعات پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے، مناجات میں جو جوش و جذبہ ہے، منقبت کا جو رنگ و آہنگ ہے اسی طرح معراج کے ذکر میں غالب کا جولب ولہجہ ہے وہ سب ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتا ہے اور غالب کی فارسی شاعری میں نہ صرف ان کی قادرالکلامی اور اس زبان پر اُن کے تسلط کو ظاہر کرتا ہے بلکہ مثنوی نگاری میں ان کے خلاقانہ ذہن نے جو خوبصورت تجربہ کیا ہے یعنی مغنی نامہ اور ساقی نامہ جیسے موضوعات کی ایک روحانی نظم شمولیت اور اس کا خوبصورت برتاؤ واقعی ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

اس نسخے کی اہمیت اسبات میں بھی پوشیدہ ہے کہ مغنی نامہ کے اشعار کی تعداد متداول مطبوعہ نسخوں میں' ۱۳۹ ہے مگر زیرنظر نسخے میں یہ تعداد ۱۴۰ ہے۔ جو شعر مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتا اور اس قلمی نسخے میں موجود ہے وہ یہ ہے:

کہ بینی بہ تاریکی روز من
فروزاں سواد دل افروز من

نسخے میں یہ شعر مغنی نامہ کا ۲۷واں شعر ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی مشہور مثنوی 'چراغ دیر' کے مطبوعہ نسخوں میں ۱۰۸ اشعار ملتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے بھی اپنی کتاب 'غالب کا سفر کلکتہ...... کے ص ۵۴ پر لکھا ہے "ایک سو آٹھ شعروں کی اس مثنوی میں ......" لیکن اس میں ۱۰۹ اشعار ہیں۔ نامہ ہای فارسی غالب' (مرتبہ علی اکبر ترمذی) ص ۲۳ پر اس مثنوی کے جو اشعار' غالب نے اپنے خط میں نقل کیے ہیں ان میں یہ شعر بھی موجود ہے

جو چراغ دیر کے نسخوں میں نقل نہیں ہوا ہے۔

فرنگستان حسن بی نقاب است
ز خاکش ذره ذره آفتاب است

حواشی:

ا۔ نامہ ہای فارسی غالب بہ سعی علی اکبر ترمذی ص ۲۱۔۲۳

ا۔ ماہنامہ آجکل اگست ۱۹۹۳ء مقالہ از ڈاکٹر حنیف نقوی: مرزا غالب کے چار غیر مطبوعہ فارسی خطوط، ص ۸

۲۔ غالب کی چند فارسی تصانیف از ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۶۱۔۲۶

شمس بدایونی

مولوی مہیش پرشاد بحیثیت غالب شناس

مرزا غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) کے تقریباً ۵۵ برس بعد، بنارس میں غالب شناسی کی جس شخص نے بنیاد رکھی، اسے مہیش پرشاد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مہیش پرشاد کی شہرت ''خطوطِ غالب'' کے مرتب کی حیثیت سے ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء کے بعد کے عرصے میں منصوبہ بند طریقے پر غالب کی اردو نثر کو یک جا اور محفوظ کرنے کے کام کا آغاز کیا تھا، لیکن ان کے تمام و کمال کام کو دن کا اُجالا نصیب نہ ہوسکا۔ جو حصہ اشاعت کے مراحل سے گزر کر 'خطوط غالب' کے نام سے ہم تک پہنچا، اس سے ان کی پہچان غالب شناس کی قائم تو ضرور ہوئی مگر نامکمل اور مشکوک۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> مہیش پرشاد کو ماہرین غالبیات' کہا جاتا ہے، لیکن غالب کے سلسلے میں انہوں نے صرف اس کتاب (مراد خطوطِ غالب) کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ چند مضامین ہو سکتے ہیں...... یہ کیسے ماہر غالبیات تھے کہ اپنا تیار شدہ متن نظر ثانی کے لیے نیز مقدمہ لکھنے کے لیے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو دے دیا۔

(غالب شناس۔ مالک رام ص: ۱۳۷)

گیان چند کے مذکورہ اقتباس سے مہیش پرشاد کی غالب شناسی پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔راقم الحروف نے اس مقالے میں مولوی صاحب کے مطالعۂ غالب اور غالبیات کا ''خطوط غالب'' کے حوالے سے اعداد وشمار کی روشنی میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔چونکہ خطوطِ غالب کی تدوین کا کام غالب شناسی کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لیے مولوی صاحب کی مطالعۂ غالب میں اولیات پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی غالب شناسی کی جہت اور معیار کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا ہے (مولوی) مہیش پرشاد ۱۷رنومبر ۱۸۹۰ء کو موضع فتح پور ہسوا، تحصیل سُراؤں، ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔(ہماری زبان دہلی یکم اگست ۱۹۹۰ء) تعلیمی اسناد کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۱۹راپریل ۱۸۹۱ء ہے۔(بیسویں صدی کے اردو مصنفین۔ص:۴۵۶)انہوں نے ۱۹۱۱ میں ''جمنا کرسچین کالج'' الہ آباد سے اسکول لیونگ سارٹیفکٹ کا امتحان پاس کیا۔۱۹۱۸ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عالم کا امتحان پاس کر کے روزگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے بالآخر ۴راکتوبر ۱۹۲۰ء کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ عربی، فارسی واردو میں بحیثیت لکچرار ان کا تقرر ہوا۔۱۶راپریل ۱۹۲۴ء کو ترقی پاکر اسی شعبے میں اسسٹینٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔جون ۱۹۵۱ء میں اِسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔اس طرح اکتوبر ۱۹۲۰ء سے جون ۱۹۵۱ء تک تقریباً ۳۱ برس انہوں نے بنارس میں گزارے۔

مولوی صاحب آریہ سماجی خیالات وعقائد کے مبلّغ تھے۔دیانند سرسوتی (ف ۱۸۸۳ء) سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔مذہب سے گہری وابستگی کے سبب وہ الہ آباد میں جمنا کنارے پر واقع موضع رسول آباد میں منتقل ہوگئے اور وہیں ۲۹،۳۰راگست ۱۹۵۱ء کی درمیانی شب میں انتقال فرمایا۔

مولوی صاحب نے زندگی بھر لکھنے پڑھنے سے شغف رکھا۔عمر کا بڑا حصہ مطالعۂ غالب میں صرف کیا۔جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے۔

مولوی صاحب نے طلبہ کے لیے دو کتابیں مرتب کیں:

(۱) مشاہیر ادب اردو (الہ آباد ۱۹۳۲ء)

(۲) مشاہیر اردو کے خطوط (الہ آباد ۱۹۳۲ء) بیس مشاہیر کے خطوط مع حالات۔

ان کے علاوہ ''عالم وفاضل بکڈپو الہ آباد'' نے کتابچوں (ٹریکٹ) کی صورت میں اردو ہندی میں ان کے بعض مضامین شائع کیے:

(۱) مہرشی دیانند سرسوتی (۲) مہرشی جیون درشن (۳) مہرشی دیانند۔کہاں اور کب (۴) دیانند کال میں ریل مارگ (۵) سرسید احمد خاں اور سوامی دیانند (٦) امرستیارتھ پرکاش (۷) ستیارتھ پرکاش پرچار (۸) بھارت میں عیسائی (۹) منورنجن حساب۔

علمی نوعیت کی چند کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) خطوط غالب جلد اول (الہ آباد۔۱۹۴۱ء)

(۲) اسلامی تیوہار کے موضوع پر ایک کتاب (الہ آباد ۱۹۴۸ء)

(۳) سنہ ہجری وعیسوی پر ایک کتاب

(۴) ایران یاترا پر بہ زبان ہندی سفرنامہ

مولوی صاحب کے مذکورہ بالا تصنیفی وتالیفی کام کو آج گرد گمنامی کی تہہ نے ڈھانپ لیا ہے۔ جو غیر مطبوعہ تھا وہ ضائع ہو گیا۔ انہوں نے مالک رام کے نام اپنے ایک خط مکتوبہ ۲۲ رجولائی ۱۹۴۹ء (مشمولہ نقوش مکاتیب نمبر۲ص ٦۴۵) میں حسب ذیل تین کتب کا تذکرہ کیا ہے، جو منتظر اشاعت تھیں۔

۱۔خطوط غالب جلد دوم

۲۔غالب کی عکسی تحریریں!

۳۔خط بنام غالب مع جوابات

غالب کے متعلق مذکورہ تینوں کتب کے بارے میں اب یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ ضائع ہو چکی ہیں۔

مولوی مہیش پرشاد غالب کے خطوط کی جمع آوری اور ان کی ترتیب وتدوین کے لیے کب اور کیوں مستعد ہوئے؟ اس تلاش وتحقیق کا پس منظر اور منشاء کیا تھا؟ انہوں نے یہ کام کس طور انجام دیا؟ خطوط غالب کی تاریخی ترتیب اور تدوین متن پر کیا مولوی صاحب سے پیشتر بھی توجہ دی گئی تھی؟ مذکورہ سوالات پر غور وخوض کیے بغیر مولوی صاحب کے غالبیات پر خصوصی مطالعے اور کام کا جائزہ شاید ممکن نہیں ہوگا۔

جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا کہ مولوی مہیش پرشاد ۱۶ راپریل ۱۹۲۴ء کو ترقی پا کر شعبہ اردو میں اسسٹینٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ غالب کے خطوط پڑھانے کے دوران انہیں یہ احساس ہوا کہ پیش نظر متن درست نہیں۔ انہوں نے دیباچہ کی ابتدائی سطروں میں لکھا ہے:

> سنہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے کہ مجھے مرزا غالب کے خطوط کو پڑھانا پڑا۔ اُس وقت مطبوعہ خطوط کے اغلاط واسقام معلوم ہوئے اور ان کے باب میں بعض اُمور کا خیال ہوا۔ چنانچہ اُسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یہ نسخہ حضرت غالب کے قدردانوں کی خدمت میں پیش ہورہا ہے۔ (ص: ز، ی)

۱۹۲۴ء سے وسط ۱۹۳۳ء تک وہ غالب کے خطوط کے مجموعوں کی دستیابی، غالب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط کا حصول، غالب کے تلامذہ کے ورثا کی تلاش اور ان کے یہاں موجود آثارِ غالب تک دسترس کے سلسلے میں عملی جدوجہد کرتے رہے اور دستیاب مواد کی چھان پھٹک بھی جاری رکھی۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں انہوں نے آٹھ صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ بہ عنوان ''صلا ہے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے'' (غالب کے قدر شناسوں کے نام غالب کے مکتوب الیہم کے حالات کی دریافت کے لیے) شایع کیا۔ جس میں غالب کی عکسی تحریر کے ساتھ ترتیب خطوط کے سلسلے میں جو کام کیا جا چکا تھا اس کا خاکہ پیش کیا اور اہل ادب سے ترتیب خطوط کے سلسلے میں تعاون کرنے کی اپیل کی اس اپیل کا منشا یہ تھا کہ اگر کسی شخص کے پاس غالب کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ خط ہو یا اس کی نقل ہو تو وہ مولوی صاحب کو مطلع کرے۔ اسی اپیل میں غالب کے حسب ذیل پندرہ مکتوب الیہم کے حالات دریافت کیے گئے تھے:

(۱) منشی غلام بسم اللہ (۲) مولوی احمد حسن خاں مینا مرزا پوری (۳) حکیم سید احمد حسن مودودی سہوانی (۴) میر احمد حسن میکش (۵) منشی ہر گوبند سہائے (۶) سید بدرالدین فقیر (۷) لالہ کیول رام ہشیار (۸) مولوی کرامت علی (۹) میر بندہ علی عرف میرزا میر (۱۰) میر افضل علی عرف میرن صاحب (۱۱) مرزا یوسف علی خاں، عزیز (۱۲) مولوی عزیز الدین

(۱۳) نواب میر ابراہیم علی خاں وفا (۱۴) منشی جیب اللہ ذکا (حیدرآبادی) (۱۵) منشی ہیرا سنگھ۔

(خیابان۔ لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۳۳۔ ص:۹۵)

مذکورہ اپیل کی تلخیص کر کے گشتی چٹھی کے طور پر ملکی اخبارات و رسائل نے بھی شائع کیا۔ اس طرح کی دو اشاعتیں میرے علم میں ہیں:

۱۔ حضرت غالب دہلوی کے قدر شناسوں کی خدمت میں، ہفتہ وار ذوالقرنین بدایوں، ۲۲ر نومبر ۱۹۳۳ء

۲۔ حضرت غالب دہلوی کے قدر شناسوں کی خدمت میں ماہنامہ شاعر آگرہ جنوری ۱۹۳۴ء خیابان (لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۳۳) نے اس اشتہار کا خلاصہ اپنے الفاظ میں درج کیا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس اشتہار سے پیشتر ایک اور گذارش غالب کے اس مصرعے کو عنوان بنا کر پیش کی گئی تھی۔

دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے۔

جس کا شاید خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

مولوی صاحب نے ملک کے بعض اہل علم و قلم کو خطوط لکھ کر ذاتی طور پر بھی اس منصوبے کی تکمیل میں مدد چاہی۔ اس سلسلے کے چند خطوط محی الدین قادری زور (ف ۱۹۶۲ء) کے نام نقوش لاہور مکاتیب نمبر ۲۰ میں شامل ہیں۔

مولوی صاحب نے غالب اور غالبیات سے متعلق ۱۹۳۳ء تک جو مواد جمع کرلیا تھا اس کا علم رسائل میں بکھرے ان چند مضامین سے بھی ہوتا ہے، جو انہیں ایام میں لکھے گئے تھے۔ راقم الحروف نے ان کے اٹھارہ مضامین کی فہرست بنائی ہے۔ گیارہ مضامین خطوطِ غالب کی اشاعت (۱۹۴۱ء) سے پیشتر کے جریدوں میں شائع ہوئے۔ باقی سات مضامین کی اشاعت بعد کے عرصے میں عمل میں آئی۔ ان مضامین کے عنوانات کسی نہ کسی طور پر خطوط غالب کی ترتیب و تدوین کے منصوبے سے متعلق معلوم ہوتے ہیں اسی طرح مشاہیر اردو کے خطوط'' کتاب بہ ظاہر انہوں نے طلبہ کے لیے لکھی تھی لیکن دراصل یہ بھی ''خطوط غالب'' کا پیش گفتار بن گئی ہے۔ مولوی صاحب سید مسعود حسن رضوی ادیب کے

نام ایک خط مکتوبہ ۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء میں لکھتے ہیں:

غالب کے خطوط کے سلسلے میں ضروری ہے کہ دیگر مشاہیر کے خطوط کو بھی حتی الامکان بخوبی دیکھ لوں۔ چنانچہ اسی امر کے باعث ''مشاہیر اردو کے خطوط'' نامی ایک چھوٹی سی کتاب تیار ہوگئی، جو علیحدہ ارسالِ خدمت ہے۔

(نقوش مکاتیب نمبر ۶۳۴)

یہ حقیقت ہے کہ اُس دور میں مکاتیب غالب کے ناقدانہ نسخے کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ اُس وقت تک جملہ خطوط غالب یک جا طور پر بھی کسی ایک مجموعے میں تاریخی ترتیب سے جمع نہیں ہوئے تھے۔ اُس وقت میں سب سے بڑا مجموعہ خطوط کریمی پریس لاہور کا ۱۹۲۶ء کا مطبوعہ ایڈیشن ''اردوئے معلیٰ'' تھا۔ غالب کے مکتوب الیہم کے کوائف ان کی علمی وادبی حیثیت کے بارے میں معلومات کا بھی بہ ظاہر کوئی ذریعہ حصول نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں مولوی صاحب کے دماغ میں غالب کے خطوط یک جا کرنے، تاریخی تریب سے مرتب کرنے، مطبوعہ خطوط کو اصل سے ملانے، متن کو درست کرنے، اغلاط کتابت کی تصحیح کرنے، مطبوعہ نسخوں کے متنی اختلاف کو درج کرنے، ان پر حواشی چڑھانے، املائے غالب اور اِعراب واوقاف کے ساتھ ان کے سنوارنے کے خیال کا آنا بجائے خود غیر معمولی بات تھی۔ چہ جائیکہ اس خیال کو عملی صورت میں ایک مثالی نمونے کے طور پر پیش کر دینا۔ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے خطوط کی، تدوینِ متن کے لحاظ سے اولین روایت مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی مرتبہ ''مکاتیب غالب'' (بمبئی ۱۹۳۷ء) ہے۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا۔ اول تو یہ کہ مکاتیب غالب طبع اول بعض نوابین رامپور اور ریاست رامپور سے وابستہ چند اہم افراد کے نام ۱۱۷ خطوط پر مشتمل ہے۔ جس کے کل چھ مکتوب الیہ ہیں۔ یہ غالب کے کل خطوط کا احاطہ نہیں کرتی۔ دوم یہ کہ ''مکاتیب غالب'' کی ترتیب کا منصوبہ ۱۹۳۶ء میں کرنل بشیر حسین زیدی (ف ۱۹۹۲ء) کی خواہش پر بنایا گیا تھا۔ (غالب کے خطوط (مقدمہ) ۱۱۷ص: ۴۱) جب کہ ''خطوط غالب'' کی ترتیب کا خاکہ ۱۹۲۴ء میں تیار کر لیا گیا تھا اور ۱۹۳۳ء تک اس پر کچھ کام بھی کیا جا چکا تھا۔ اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ

مولوی مہیش پرشاد کی کتاب ترتیب کے لحاظ سے مقدم ہے اور اشاعت کے لحاظ سے مؤخر۔ ''خطوط غالب'' کا ترتیب کے لحاظ سے مقدم ہونے کا ایک ثبوت مولوی صاحب کے بعض وہ مضامین ہیں جو خطوط غالب، کی اشاعت سے پیشتر ۱۹۳۳ سے ۱۹۴۱ء کی درمیانی مدت میں ملکی رسائل میں شائع ہوئے۔ (مولوی صاحب کے دستیاب مضامین کی فہرست مضمون کے آخر میں پیش کر دی گئی ہے۔) ان مضامین کا راست تعلق خطوط غالب کے مواد یا اس کے تعلقات سے ہے۔

مکاتیب غالب کی تاریخی تدوین کی طرف ڈاکٹر سید عبدالطیف (ف ۱۹۷۱ء) نے بھی اپنی انگریزی کتاب غالب (Ghalib A critical appreciation of his life and urdu poetry) میں توجہ دلائی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب کے باب سوم میں غالب کے شائع شدہ خطوط کے چار ادوار متعین کیے اور ہر دور کو حیاتِ غالب سے متعلق کر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک نقشے کی صورت میں جملہ مکتوب الیہم کے نام، خط و کتابت کی مدت، اور مکاتیب کی تعداد کو دکھایا ہے۔ ۵۳ مکتوب الیہم کے نام ۵۴۶ خطوط میں ۲۱۶ تاریخی اور ۲۸۰ بلا تاریخی ہیں۔ عبدالطیف نے تاریخوں سے عاری خطوط کی زمانی ترتیب کی صورت پر غور کیا ہے اور داخلی شہادتوں کی مثالیں دے کر ان کے زمانہ کتابت کے طے کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ انہوں نے ''دیوان غالب'' کو تاریخی ترتیب سے مدوّن کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر دیوان غالب کی اشاعت ممکن ہوگئی ہوتی تو وہ خطوط کی تاریخی ترتیب کی طرف بھی متوجہ ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ کام تو مولوی مہیش پرشاد کے ہاتھوں انجام پانا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ''خطوطِ غالب''[۵] کا سرورق یہ ہے:

''خطوط غالب / مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خط، رقعے وغیرہ / مہیش پرشاد / نے مختلف ماخذوں سے جمع کر کے ترتیب دیے / عبدالستار صدیقی / نے نظر ثانی کی / پہلی جلد / ۱۹۴۱ / ہندوستانی اکیڈمی، صوبہ متحدہ الہ آباد'' سرورق کی پشت پر انگریزی میں ناشر، ایڈیشن، قیمت اور پریس کے نام کا اندراج ہے۔ (قیمت مجلد ۵ روپے۔ مطبوعہ ایس غلام سنگ پریس، الہ آباد) ناشر: ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ایڈیشن اول) کتابی کوائف میں تعدادِ

اشاعت کا مذکور نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ کتاب ۵۰۰ چھپی تھی۔

خطوط غالب میں اول ۱۶ صفحات کا مقدمہ ہے ۔(الف تا وی) بقلم (ڈاکٹر) عبدالستار صدیقی ۔الہ آباد۔مکتوبہ ۱۵/مارچ ۱۹۴۱ء ۔اس کے بعد ۵ صفحات پر مشتمل مولوی مہیش پرشاد کا دیباچہ ہے ۔(زی تا رک) بنارس۔مکتوبہ جنوری ۱۹۴۱ء سے ایک صفحہ سادہ ہے۔سامنے کے صفحے پر فہرست کے عنوان سے مکتوب نگاروں کی فہرست ہے۔جس میں کل ۱۹/اندراج ہیں ۔۲،اندراج مجہول الاسم ہیں ۔فہرست میں مکتوب نگار کا نام اور صفحہ نمبر کا اندراج ہے ۔خطوط کی تعداد نہیں ۔فہرست کے بعد کا صفحہ پھر خالی چھوڑا گیا ہے۔آگے کے صفحات صفحہ۱ تا ۴۰۸ خطوط کا احاطہ کرتے ہیں۔آخر میں ۲ صفحے کا غلط نامہ ہے۔اس طور کتاب ۲۶+۴۱۰=۴۳۶ صفحات کو محیط ہے۔

مقدمے اور دیباچے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس مجموعہ خطوط کی ترتیب میں حسب ذیل شقوں کا التزام کیا گیا ہے:

۱۔ ہر ایک مکتوب الیہ کے نام جملہ دستیاب خط، تاریخی ترتیب سے مرتب کیے گئے ہیں۔

۲۔ ہر مکتوب الیہ کے پہلے خط کی تاریخ کے لحاظ سے مکتوب الیہم کو مقدم و موخر رکھا گیا ہے۔

۳۔حتی المقدر تاریخوں کو طے کیا گیا ہے۔ہجری کی عیسوی میں بدل کر تمام تاریخوں کو ایک ڈھنگ میں رکھتے ہوئے انہیں خطوط کے آخر میں درج کیا ہے۔اضافہ شدہ تاریخیں قوسین میں دی گئی ہیں۔

۴۔جن خطوط پر مطلقاً تاریخ نہیں ہے اُن کو کسی داخلی شہادت کی بنیاد پر کسی خاص زمانے کا مکتوبہ خیال کرتے ہوئے اس زمانہ میں کچھ لکھے گئے تاریخ کے حامل خطوط کے درمیان بنا تاریخ شامل کیا ہے تاکہ ان کے عہد کتابت کا اندازہ لگایا جاسکے۔

۵۔اردوئے معلیٰ و عودِ ہندی میں شامل خطوط کو دستیاب اصل خطوط سے ملا کر متن کی اصلاح کی اور محذوف عبارتوں یا تاریخوں کا اضافہ کیا۔امکان بھر کتابت کی اغلاط کو درست کیا اور مختلف طباعتوں کے اہم اختلافِ نسخ کو فٹ نوٹ میں پیش کیا۔

۶۔نجی ذخیروں سے جو غیر مطبوعہ خطوط حاصل ہوئے ان کو پیش کیا۔مختلف رسائل و کتب میں

شامل غیر مطبوعہ خطوط کو بھی تلاش کیا اور چھان پھٹک کے بعد ان کو مجموعے میں شامل کیا۔
۷۔ متن کی نظر ثانی اور طباعت کی نگرانی کا کام عبدالستار صدیقی سے لیا گیا۔

مذکورہ بالا شقوں سے ترتیب کے طریقہ کار پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے۔ سطور ذیل میں چند ضمنی عنوانات کے تحت خطوط غالب کی ترتیب و تدوین کی نوعیت پر گفتگو کی جا رہی ہے:

۱۔ تعداد خطوط، ماخذ، عکس وغیرہ: خطوط پر دو قسم کے نمبر دیے گئے ہیں۔ ایک نمبر ہر خط کے آغاز میں دائروں کے اندر حاشیے پر درج ہے۔ یہ مسلسل نمبر شمار ہے جو خطوط کی جملہ تعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک نمبر شمار ہر مکتوب الیہ کے نام خطوط پر دیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایک مکتوب الیہ کے نام کل خطوط کی تعداد بیک نظر معلوم ہو جائے مسلسل نمبر شمار سے خطوط کی کل تعداد ۴۵۲ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ تعداد ۴۵۳ ہے۔ وہ اس طرح کہ میر مہدی مجروح کے نام خط نمبر ۴۹ پر مشتمل نمبر شمار ۳۳۱ الف اور خط نمبر ۵۰ پر ۳۳۱ ب درج ہے۔ اس لیے یہ تعداد ۴۵۳ ہو جاتی ہے لیکن حقیقتاً خطوط کی جملہ تعداد کو ۴۵۲ ماننا درست ہوگا کیوں کہ خط نمبر ۲۹ بنام تفتہ (ص: ۲۵) کو علیحدہ خط کی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ خط، خط نمبر ۲۸ کا خاتمہ ہے۔ اردوے معلّٰی اول و دوم میں یہ دونوں اجزا ایک خط کے طور پر شامل تھے لیکن بعد کی اشاعتوں میں انہیں دو رقعے مان لیا گیا۔ مالک رام نے اپنے نسخے میں اس کی تصحیح کی۔ بعد میں ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اس کا اتباع کیا (ج ۱/ ص: ۳۱۱)

جہاں تک خطوط کے ماخذ کا سوال ہے۔ دیباچہ اور حواشی سے صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ اردوئے معلّٰی طبع اول و دوم، عود ہندی اول، مکاتیب غالب اول (عرشی) سے جملہ خطوط لیے گئے ہیں۔ اِن کے علاوہ وہ خطوط جو ادھر ادھر شائع ہوئے، یا کسی کے ذاتی ذخیرے سے دستیاب ہوئے۔ اُن کا ذکر دیباچے یا حاشیے میں کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجموعے میں شامل کسی بھی خط سے اس کے انفرادی ماخذ کا پتا نہیں چلتا۔ مقدمہ میں عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے کہ خطوط غالب، کی دوسری جلد میں ایک فہرست خطوط ہوگی اس میں ہر خط کا ماخذ ہوگا۔ یہ جلد طبع نہیں ہو سکی۔

راقم الحروف کو اردوئے معلّٰی اور عود ہندی کی اول و دوم اشاعتیں فراہم نہیں ہو سکیں۔

بعض ثانوی ذرائع سے میں نے ''خطوط غالب'' میں شامل کل خطوط کے اصل ماخذ کی ایک فہرست تیار کی ہے۔ فہرست سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولوی صاحب نے کس اشاعت سے کتنے خطوط لیے اور کتنے نئے خطوط کا اضافہ کیا۔ خطوطِ غالب، کی فہرست میں جس ترتیب سے مکتوب الیہ کے نام آئے ہیں نقشے میں اسی ترتیب کو اختیار کرلیا گیا ہے۔ کیفیت کے کالم میں چند دوسرے نئے ماخذ یا دوسرے ضروری امور پر گفتگو مقصود تھی جو صفحے پر مناسب جگہ نہ مل پانے کے سبب نقشے کے نیچے شامل کر دی گئی ہے۔ اسے سلسلہ وار نمبر شمار کے تحت ہی درج کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	نام مکتوب الیہ	تعداد	اردوئے معلی اول	عود ہندی اول	اردوئے معلی دوم	مکاتیب غالب	کل خطوط	اضافہ	کیفیت
۱	مرزا تفتہ	۱۲۴	۸۹	۱	۳۴		۱۲۴		نقشے کے نیچے نمبر شمار ۱ تحت
۲	جواہر سنگھ جوہر	۳	۲		۱		۳		
۳	بدرالدین فقیر	۵	۵				۵		
۴	عبدالجمیل، جنون	۳۰	۱۱	۱۷			۱۷	۱۳	نمبر شمار ۱۳ کے تحت نیچے ملاحظہ کریں
۵	انوار الدولہ شفق	۲۱	۱۹	۲۰			۲۰	۱	نمبر شمار ۲ کے تحت دیکھیں
۶	سید یوسف مرزا	۱۲	۱۲			۱۲			

۷	یوسف علی خاں عزیز	۳	۱	۲			۳		
۸	احمد حسین میکش	۲	۲				۲		
۹	قدر بلگرامی	۲۲						۲۲	نمبر شمار ۹ دیکھیں
۱۰	نواب یوسف علی خاں ناظم	۳۷				۳۷	۳۷		
۱۱	حکیم غلام نجف خاں	۲۳	۲۳				۲۳		
۱۲	میر مہدی مجروح	۵۰	۴۳	۳۱	۲		۴۶	۳	نمبر شمار ۱۲ دیکھیں
۱۳	شہاب الدین احمد خاں ثاقب	۹	۹				۹		
۱۴	مرزا حاتم علی مہر	۱۸	۱۸	۱۸			۱۸		نمبر شمار ۱۴
۱۵	صاحبزادہ زین العابدین خاں	۲				۲	۲		

۱۶	علاؤالدین احمد خاں علائی	۵۶	۵۶	۱			۵۶		
۱۷	بنام(؟)	۱						۱	نمبر شمار ۱۷؎ دیکھیے
۱۸	شیو نرائن آرام	۳۴		۳۴			۳۳	۱	دیکھیے ۱۸؎
۱۹	بنام(؟)	۱						۱	دیکھیے ۱۹؎

۱؎ بنام مرزا تفتہ: مہر کے نام خط کو خارج کر کے تفتہ کے نام کل خطوط ۱۲۳ رہ جاتے ہیں۔ مکتوب الیہ کا انتخاب' سرخی کے تحت تفصیل آئندہ سطور میں آرہی ہے۔

۴؎ بنام جنوں: دیباچہ میں مرتب نے صراحت کی ہے کہ جنوں کے بیٹے قاضی محمد خلیل حیراں بریلوی (ف ۱۹۳۹) سے غالب کے ۱۳ نئے خطوط حاصل ہوئے۔ لفافوں کے عکس اور اصلاحیں اس کے علاوہ ہیں۔

۵؎ بنام شفق: شفق کے نام ایک خط کا اضافہ ہوا ہے جس کا مسلسل نمبر شمار ۱۷ ہے۔ شفق کے نام یہ خط نمبر ۱۰ اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۳۴ء سے لیا گیا ہے۔

۹؎ بنام قدر بلگرامی: یہ کل خطوط حسرت موہانی کے رسالے اردوئے معلیٰ علی گڑھ دسمبر ۱۹۰۷ء سے لیے گئے ہیں۔ یہ خطوط مکمل اردوئے معلیٰ مطبوعہ مطبع کریمی الہ آباد ۱۹۲۲ کے ایڈیشن میں ضمیمے کے طور پر شامل ہیں۔ رسالہ ہندوستانی الہ آباد کی جلد تین و چار میں بھی عبدالستار صدیقی نے ان کے متن کو درست کر کے شائع کرا دیا تھا۔ مرتب کے پیش نظر یہ تمام ماخذ رہے ہیں۔ جن کا ذکر دیباچہ میں آگیا ہے۔

۱۲؎ مجروح کے نام خطوط کے مأخذ مختلف ہیں۔ خط نمبر ۱۷، ۴۷، اردوئے معلیٰ مجتبائی ایڈیشن ۱۸۹۹ء سے لیے گیے ہیں۔ اور خط نمبر ۴۵ 'انتخاب غالب' (قلمی نسخہ مملوکہ عبدالستار صدیقی) سے اخذ کیا گیا ہے۔ دیباچہ میں دی گئی اطلاع کے مطابق ایک خط غالب کے شاگرد لالہ

بہاری لال مشتاق کے بیٹے لالہ چندولال سے دستیاب ہوا۔اس خط کا نمبر۴۲ ہے جو مع عکس کتاب میں شامل ہے۔اس طور۴ خط کا اضافہ ہوا۔

۱۴بنام مہر: تفتہ کے نام خط نمبر ۵۸ جو واقعتاً مہر کے نام ہے شامل کرنے سے مہر کے نام خطوط کی تعداد ۱۹ ہو جاتی ہے۔

۱۷بنام؟: یہ مجہول الاسم خط صفدر مرزا پوری کی کتاب مرقعِ ادب حصہ۲ (لکھنؤ سنہ ندارد) سے لیا گیا ہے۔اس سے پیشتر یہ خط رسالہ تصویر جذبات (لکھنؤ) فروری ۱۹۲۴ء سے شائع ہوا تھا۔یہ خط دراصل منشی شیونرائن آرام کے نام ہے۔جس کا ذکر آئندہ سطور میں مکتوب الیہ کا انتخاب سرخی کے تحت آ رہا ہے۔

۱۸نمبر شمار ۱۷ کے تحت مجہول الاسم خط کو بھی اگر شامل کر لیا جائے تو شیونرائن آرام کے نام خطوط کی تعداد ۳۵ ہو جائے گی۔دیباچہ میں دی گئی اطلاع کے مطابق اضافہ شدہ خط پنڈت گوپی ناتھ صاحب سے ملا تھا جو مع عکس شامل کر لیا گیا۔

۱۹مہیش پرشاد کو کسی معتبر شخص سے اس خط کی نقل ملی ہے اور اسے انہوں نے کتاب میں شامل کر لیا۔خط ابھی تک مجہول الاسم ہے۔"خطوط غالب" میں شامل جملہ مکاتیب کے ماخذ پر مشتمل مذکورہ فہرست سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مہیش پرشاد نے خطوط کی جمع آوری میں اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی میں شامل مشترک خطوط کے علاوہ ۳۹ خطوط" مکاتیب غالب" (مطبع بمبئی۔۱۹۳۷) سے اخذ کیے اور ۴۳ خطوط آوارہ اور منتشر ماخذ سے جمع کیے اس طور ۴۵۲ خطوط کا قابلِ قدر ذخیرہ فراہم کر دیا۔

"خطوطِ غالب" میں ۵ خطوط اور دو لفافوں کے عکس بھی شامل کیے گئے ہیں۔غالب کے خطوط کے اس وقت تک شائع شدہ کسی مجموعے میں عکس کی اشاعت کی غالباً یہ اولین روایت ہے۔ان عکسوں کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔خط نمبر ۶ بنام مرزا تفتہ ص:۶ اور ۷ کے درمیان

۲۔خط نمبر ۱۳۶ بنام جنون بریلوی ص:۱۱۶ اور ۱۱۷ کے درمیان

۳۔خط نمبر ۱۴۵ بنام جنون بریلوی ص:۱۲۰ اور ۱۲۱ "

۴۔خط نمبر ۳۲۴ بنام مجروح ص:۲۸۰ اور ۲۸۱ "

۵۔ خط نمبر ۴۴۸ بنام آرام ص: ۴۰۴ اور ۴۰۵‘‘
ا۔ عکس لفافہ بنام جنون بریلوی ص: ۱۱۲ اور ۱۱۳ کے درمیان (مکتوب ۱۸۶۶ء)
۲۔ ایضاً ص: ۱۱۶ اور ۱۱۷‘‘ (مکتوب ۱۸۵۹ء)

لفافوں کے عکس، غالب کے پتا لکھنے کے طریقے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۶ء کے ہیں۔ مالک رام کے نام ایک خط میں مولوی صاحب نے لکھا تھا:

جناب جنون کے جو لفافے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں سب سے پرانا لفافہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کا تھا۔ ان کے متعلق کچھ نوٹ کیا تھا مگر وہ اب نہیں مل رہا ہے۔ تلاش کر کے پھر لکھنے کی کوشش کروں گا۔

(خط نمبر ۔ ۱۱ مکتوبہ ۱۹۴۷ نقوش ص: ۶۴۱)

مولوی صاحب کو یہ لفافہ نہیں مل سکا اور خط بھی۔ کیوں کہ مجموعے میں شامل جنون کے نام پہلا خط بدونِ تاریخ ہے اور اس پر قوسین میں ۱۸۵۴ء درج ہے۔

۲۔ مکتوب الیہم کا انتساب: مکتوب الیہ کا انتساب بیشتر صحیح اور درست ہے۔ صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط (خط نمبر ۵۸) مرزا تفتہ کے نام سے شامل ہو گیا ہے۔ اس غلطی سے پہلی بار قاضی عبد الودود نے اپنے تبصرے میں مطلع کیا تھا (معیار، اکتوبر ۱۹۴۲ء) انہوں نے یہ بھی لکھا: ’’یہ غلطی غالباً ابتدا ہی سے چلی آتی ہے۔ خطوط غالب میں اس کی تصحیح نہ ہو سکی‘‘۔ (کچھ غالب کے بارے میں ج ۲ ص: ۵۴۹) بعد میں غلام رسول مہر (خطوط غالب ص: ۲۲۱) مالک رام (خطوط غالب ص: ۳۵۵) اور خلیق انجم (غالب کے خطوط ج ۲/ ص: ۷۱۱) نے اپنے اپنے نسخوں میں اسے مہر کے نام ہی سے شامل کیا۔

خطوط غالب کے ص: ۳۷۰ پر ایک خط کسی نامعلوم فرد کے نام ہے۔ یہ خط مولوی صاحب کے درج کردہ حاشیے کے مطابق صفدر مرزا پوری کی کتاب مرقع ادب حصہ ۲ (مطبوعہ لکھنؤ۔ سال اشاعت نامعلوم) سے لیا گیا تھا یہ خط پہلی بار رسالہ ’’تصویر جذبات‘‘ لکھنؤ (فروری ۱۹۲۴ء) میں چھپا تھا۔ وہیں سے مختلف کتب و رسائل میں نقل ہوتا رہا۔ اس رسالہ کے مدیر احمد عزیز کیفی نے لکھا تھا کہ یہ خط ان کے دادا کے نام ہے۔ لیکن دادا

کا نام انھوں نے نہیں بتایا۔ بعد میں اردوئے معلیٰ جلد۲ کے صدی ایڈیشن میں اس کے مرتب سید مرتضیٰ حسین فاضلؔ نے اسے پہلی بار منشی شیونرائن آرامؔ کے نام سے منسوب کیا۔(ص۹۹۰) فاضل صاحب خط کے مضمون ہی سے صحیح مکتوب الیہ تک پہنچے۔ان کے خیال میں خط میں جس کتاب کی اشاعت کی فرمائش کی گئی ہے وہ 'دستنبو' ہے۔اور 'دستنبو' کو شیونرائن آرام نے چھاپا تھا۔فاضلؔ کے اس خیال کو درست تسلیم کرلیا گیا۔بعد کے مجموعوں میں یہ خط آرامؔ کے نام ہی منسوب کیا گیا ہے ۔(دیکھیے: غالب کے خطوط ج۳۔ص:۱۰۴۸)

انوار الدولہ شفقؔ کے نام خط نمبر ۱۰ کا انتساب اس خط کی پہلی اشاعت (اردو اورنگ آباد۔ جنوری ۱۹۳۴ء) کے مطابق ہے۔ بعد میں ایک اور خط کے ساتھ نقوش خطوط نمبر جلد۱ میں محمد نعیم الحق آزادؔ کے نام سے شایع ہوا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اسے آزاد کے نام ہی سے شامل کیا ہے ۔(ج ۲ ص ۷۲۵) لیکن یہ نسبت بغیر کسی ثبوت کے ہے۔ کسی بھی اولین روایت کی تردید یا اس میں ترمیم کسی داخلی یا خارجی شہادت کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں 'خطوط غالب' میں شفقؔ کے نام اُس خط کا انتساب درست ہے۔اس طرح خطوط غالب میں مجہول الاسم ایک خط رہ جاتا ہے اس خط کا مکتوب الیہ ہنوز نامعلوم ہے۔

۳۔ **خطوط کی تاریخیں**: اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں شامل خطوط میں کسی طرح کی ترتیب نہیں تھی۔ کسی ایک شخص کے نام کے خطوط تاریخی ترتیب تو کیا یک جا بھی نہیں تھے۔ فہرست کا بھی اہتمام نہیں تھا۔ تاریخوں کے اندراج کو بھی اہمیت نہیں دی گئی تھی ۔ جولائی ۱۹۲۲ء میں مکمل اردوئے معلیٰ ہر دو حصہ محمد منیرؔ منیر کی ترتیب سے مطبع مجیدی کانپور سے طبع ہوا جس میں پہلی بار ہر مکتوب الیہ کے نام کے خطوط ایک جگہ پیش کیے گئے تھے۔ شروع میں مکتوب الیہم کی فہرست مع تعداد خطوط بھی دی گئی تھی۔ لیکن تاریخوں سے اس میں بھی کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔

مولوی مہیش پرشاد نے پہلی بار ان خطوط کے زمانہ تحریر پر غور و خوض کیا۔ ان کے پیش نظر غالب کے مختلف قسم کے خطوط تھے۔ بعض میں دن یا مہینہ تھا مگر سنہ ندارد۔ بعض میں

صرف سنہ کا اندراج تھا۔ بعض پر یا تو مکمل تاریخ تھی یا سرے سے تاریخ ہی نہیں تھی۔ بعض خطوط پر صرف ہجری تاریخیں ہی تھیں۔ مولوی صاحب نے اول ایک سنہ عیسوی کو اختیار کیا اور ہجری سنوں اور تاریخوں کی تطبیق کی۔ دوم جن خطوط پر صرف دن یا مہینہ تھا یا محض تاریخ تھی ان کی سنین کو دریافت کیا۔ سوم جن خطوط پر سرے سے تاریخ ہی نہیں تھی ان کی تاریخ تحریر یا کم از کم زمانہ تحریر کا پتا لگایا۔ چہارم جن خطوط کی تاریخ تحریر کا صحیح طور پر تعین نہ ہو سکا اُن کو تاریخ تحریر کے حامل دوسرے خطوط کے درمیان اس طرح سے ترتیب دیا کہ وہ اُن تاریخوں کی درمیانی مدت کے مکتوبہ معلوم ہوں۔ اس جملہ تعین اور تطبیق کو خط کے آخر میں قوسین میں درج کر دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے ان تاریخوں کو کن بنیادوں پر طے کیا ہے؟ کون سے خط کی کس داخلی یا خارجی شہادت پر انہوں نے تاریخ تحریر یا زمانہ کتابت کا تعین کیا ہے؟ اس کے بارے میں انہوں نے کوئی وضاحت نہیں کی۔

راقم الحروف نے خطوط غالب میں شامل ۴۵۳ (صحیح ۴۵۲) خطوط کی تاریخوں کی فہرست بنا کر حسب ذیل اعداد و شمار حاصل کیے:

خطوط پر موجود سنین ۲۲۳

ناموجود سنین ۸۵

اضافہ کی گئی سنین ۱۴۳

ہجری سے عیسوی سنین کی تطبیق ۱۵

مذکورہ اعداد و شمار کے حصول سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۴۳ خطوط کی تاریخ تحریر کا تعین اور ۸۵ خطوط کے زمانہ کتابت کا اندازہ لگانا اور انہیں تاریخی ترتیب سے اس طرح پیش کرنا کہ ان میں زمانی فصل قائم نہ رہے مولوی صاحب کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ جو غالبیات پر حاوی ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اگر چہ بعد میں ان کی طے کردہ تاریخوں سے قاضی عبدالودود، مولوی غلام رسول مہر، مالک رام اور خلیق انجم نے اختلاف کیا۔ قاضی صاحب نے اپنے تبصرے میں ۱۸ خطوط کی تاریخوں سے بہ دلائل اختلاف کیا ہے۔ بعض تاریخوں کو انہوں نے صریحاً غلط قرار دیا اور بعض کے قبول کرنے میں تامل کا اظہار کیا۔ غلام رسول مہر نے ۱۴ مالک رام نے ۱۵ خطوط کی تاریخوں پر اپنے اختلافی نوٹ درج کیے اور

بعض کی تغلیط بھی کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان بزرگوں کے اختلافات کا جائزہ لے کر مرجح تاریخ کو اختیار کر لیا۔ انجم صاحب نے چونکہ ہر خط کے ماخذ اور اضافہ کی گئی تاریخ پر حواشی لکھے ہیں اور تاریخ کو اختیار و قبول کرنے کی وجہ بھی لکھی ہے۔ اس لیے ان کی پیش کردہ تاریخوں کے اختلاف آئینہ ہو جاتے ہیں۔ اگر چہ ان کی اختیار کردہ اور طے کردہ تاریخوں سے بھی اختلاف کی گنجائش ہے۔

غالب کے خطوط کو ماہ و سال کے حصار میں قید کر کے تاریخی ترتیب سے پیش کرنے کا سہرا مولوی مہیش پرشاد ہی کے سر ہے۔

۴۔ خطوط کے حواشی: راقم الحروف نے خطوط پر لکھے گئے حواشی کی گنتی کی۔ کل حواشی کی تعداد ۲۱۸ پائی۔ بعض حواشی پر مخففات درج ہیں۔ جن پر مخففات نہیں وہ مرتب کے لکھے ہوئے تسلیم کیے جانے چاہئیں۔ حواشی کی تفصیل یہ ہے:

غ = غالب ۳ حاشیے

مصحح = عبدالستار صدیقی ۳

ع۔ص۔ عبدالستار صدیقی ۴۶

..... = مہیش پرشاد ۱۶۶ ''کل تعداد ۲۱۸

اردوے معلیٰ اور عود ہندی کے بعض ایڈیشنوں میں حواشی بھی ملتے ہیں۔ عبدالستار صدیقی نے ان حاشیوں کو غالب کا تحریر کردہ تصور کیا اور مقدمے کی آخری سطور میں اس کا اظہار بھی کیا انہوں نے اردوے معلیٰ حصہ دوم سے اخذ کر کے تین حاشیے 'خطوط غالب' میں شامل کیے (ص: ۲، ۳۳۰، ۳۵۰) لیکن یہ حاشیے بقول قاضی عبدالودود'' مولانا حالی کے لکھے ہوئے ہیں۔ حالی نے مطلب کچھ اس طرح سمجھایا ہے گویا غالب سمجھا رہے ہیں۔ (تبصرہ خطوط غالب۔ کچھ غالب کے بارے میں۔ ص: ۴۹۳)

عبدالستار صدیقی نے 'خطوط غالب' کے فٹ نوٹ میں مصحح اور ع ص کے مخفف سے کل ۴۹ حواشی لکھے۔ مقدمے میں استدراک' کے عنوان سے بعد طباعت ۲۶ مزید حواشی کا اضافہ کیا۔ اس طور عبدالستار صدیقی کے لکھے حواشی کی کل تعداد ۷۵ ہو جاتی ہے۔ جب کہ مولوی مہیش پرشاد کے تحریر کردہ کل ۱۶۶ حواشی ہیں۔ ؎

یہاں یہ بات ذہین نشیں رکھنا چاہیے کہ عبدالستار صدیقی کا میدانِ تحقیق، غالب اور غالبیات کبھی نہیں رہا۔وہ لسانیات قواعد زبان، املا اور تقابلی لسانیات کے ماہر تھے۔صدیقی صاحب چونکہ جدید طور تحقیق سے واقف تھے لہٰذا غالب کا مطالعہ اس نہج سے کرنے پر قادر تھے۔ان کے اکثر حواشی ،اختلاف نسخ کے ساتھ ساتھ جملوں کی صحیح ساخت،عبارت کی نحوی ترکیب، نامانوس لفظوں کی تحقیق ،املائے غالب ،روش کتابت اور غالب کے سہوِ قلم کی نشاندہی سے متعلق ہیں۔بعض جگہ اشعار کی تخریج خطوط کے صحیح ماخذ اور تاریخیں بھی زیر بحث آ گئی ہیں۔جب کہ مولوی صاحب کے حواشی ،اختلاف نسخ ،تاریخوں کی غلطی، کتابت کی اغلاط ،پیچیدہ اور مبہم عبارتوں کے مفاہیم وغیرہ بھی واضح کرتے ہیں۔یہ تمام حواشی ایک ایک فقرے یا ایک ایک سطر پر مشتمل ہیں۔ایک سطر سے زائد کے حواشی صرف سات ہیں ان میں طویل ترین حاشیہ نو سطری ہے۔(ص ۳۷۳) جو ایک خط کی عبارت سے متعلق ہے۔ان ساتوں حاشیوں کا تعلق خط کی تاریخ ،ماخذ یا کسی دوسرے اختلاف سے ہے۔

مجموعی طور پر حواشی کارآمد ہیں۔لیکن کتاب کی نوعیت ترتیب کے لحاظ سے غیر ضروری طور پر مختصر اور کم ہیں۔ان خطوط میں بہت سے مقامات ابھی ایسے ہیں جن پر حاشیے کی ضرورت تھی وہ تمام مقامات مرتب کی توجہ سے محروم ہے۔

۵۔خطوط کا املا ،اِعراب وتوقیف نگاری: مقدمہ میں عبدالستار صدیقی نے املا پر عالمانہ بحث کے بعد 'خطوط' کے املا کو بالعموم غالب کے املا اور 'طرز کتابت کے مطابق پیش کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔اور متن کے قائم کرنے میں اردوئے معلیٰ اول اور بعض دستیاب اصل خطوط کے اُملا کو اساس بنانے کی اطلاع دی ہے۔انہوں نے لکھا ہے:

> خطوط غالب کے متن کو قائم کرنے میں اُن تمام اُصول کا لحاظ رکھا گیا ہے جنہیں غالب مانتے تھے اور جو صحیح ہیں۔البتہ ان کی کی طرزِ کتابت پیروی میں بات ،رت اور بعضے اور اردو لفظ اسی طرح لکھے گئے جس طرح غالب لکھا کرتے تھے۔اسی بنا پر اوس ،اودھر ،اوٹھ ،اوتنا وغیرہ (و) کے ساتھ لکھے گئے......اس

نسخے (مراد طبع اول) کے کاتب نے غالب کی طرزِ کتابت یا املا
کو اکثر جگہ برقرار رکھا ہے۔ گو بعض باتوں میں اس کی پابندی
نہیں بھی کی ہے یہ نسخہ فی الجملہ بھروسے کے قابل ہے۔ اس
لیے خطوط کا متن سوا اُس قلمی مواد کے جو میرے سامنے تھا اسی
نسخے پر قائم کیا گیا۔

(مقدمہ ص: ب ی)

اردوے معلٰی کے جس نسخے پر مقدمہ نگار نے متن کے املا کو قائم کیا ہے، وہ نسخہ فی الحقیقت غالب کے املا کے مطابق نہیں ہے۔ جہاں تک قلمی مواد کا سوال ہے مقدمہ نگار نے مرتب متن کے پاس موجود کل سرمایہ خطوط کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ صرف چند خطوط دیکھ کر انہوں نے غالب کی روشِ کتابت اور اُملا پر اپنے خیالات مرتب کر لیے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 'خطوط غالب' کو املا، اِعراب ورموزِ اوقاف سے مرتب متن نے نہیں بلکہ مصحح یعنی عبدالستار صدیقی نے مزین کیا تھا۔ خطوط غالب پر لکھنے والوں نے بالخصوص اس کے املا کو ہدف تنقید بنایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ متن کے اُملا میں کسی ایک اصول یا طریقے کی پیروی نہیں کی گئی۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالودود (تبصرہ خطوط غالب) اور ڈاکٹر خلیق انجم (مقدمہ غالب کے خطوط) نے اپنی تحریروں میں اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔

جہاں تک اِعراب اور توقیف نگاری کا سوال ہے۔ اس حیثیت سے اس پر ہنوز توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مصحح نے باوجود بعض چھاپے کی دقتوں کے اعراب لگانے میں پہلوتہی نہیں کی۔ اضافتوں (مثلاً بادشاہِ وقت نامِ اصلی۔ ص: ۳) ضمیروں (اِیں، اِن، اِتنا، اِدھر وغیرہ) لفظوں (مثلاً اُصول، اِحتیاط وغیرہ) پر اعراب لگائے ہیں تشدید اور تنوین وغیرہ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ البتہ جزم چھاپے میں کہیں نظر نہیں آیا۔ اگرچہ اعراب فی ذاتہٖ نفس املا میں شامل نہیں۔ لیکن اعراب کے اہتمام سے متن کی وضاحت آسان ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مصحح نے اعراب غالب کی تحریروں میں دیکھکر اس کے اتباع میں لگائے ہیں یا متن کی قرأت کو سریع الفہم اور رواں بنانے کی غرض

ہے۔صورت جو بھی ہو اعراب نگاری نے متن کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔

'خطوط غالب' میں رموزِ اوقاف اور علامات و اشارات کا استعمال اس طرح کیا گیا ہے جس طرح انگریزی کی کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ خصوصیت خطوط کی اب تک چھپنے والی تمام اشاعتوں سے اسے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ مجموعے میں جن رموزِ اوقاف کا استعمال کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

سکتہ (،) وقفہ (؛) رابطہ (:) تفصیلیہ (:۔) ختمہ (۔) سوالیہ (؟) فجائیہ (!) قوسین () یا () واوین "''"

حواشی میں ہندسوں (۱،۲،۳،۴) کے ساتھ ساتھ ستاروں (☆، ☆☆، ☆☆) کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر قدیم علامت صلیب (+) بھی ہندسوں کے قائم مقام استعمال کی گئی ہے۔ یہ شاید چھاپے کی مجبوری ہو۔ ریاضی کی علامت برابر (=) کا بھی خال خال استعمال ہوا ہے۔ اسمائے معرفہ اور تخلص کو نمایاں کرنے کے لیے واوین کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مجموعہ توقیف نگاری کا بھی ایک مثالی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

خطوطِ غالب طبع دوم: خطوطِ غالب طبع دوم کو انجمن ترقی اردو ہند نے مالک رام سے نظر ثانی کرا کر ۱۹۶۲ء (صحیح ۱۹۶۳ء) میں شائع کیا۔ اس میں بقول ڈاکٹر گیان چند مالک رام نے حسب ذیل اضافے کیے:

۱۔ ۷۶ نئے خطوں کا اضافہ کیا...... ان میں سے چند غیر مطبوعہ تھے۔

۲۔ ایک مکتوب الیہ کا غلط انتساب درست کیا

۳۔ ۱۲ خطوط کی تاریخوں میں ترمیم و اصلاح کی اور اس کی مناسبت سے خطوط کی ترتیب بھی بدلی۔

۴۔ کم از کم ۹۶ حواشی بڑھائے۔

۵۔ بعض خطوط کے متن درست کیے۔

اتنی تبدیلیوں کے بعد انجمن کا ایڈیشن مہیش پرشاد کے ایڈیشن کی دوسری چھاپ نہیں رہتا اور مالک رام مرتب کا درجہ پا جاتے ہیں۔

غالب شناس۔ مالک رام: ص: ۱۴۱۔۱۴۲

اس نسخے پر انجمن کی غلطی سے مالک رام کا نام طبع ہوگیا تھا۔ جس پر بہت دنوں لے دے رہی۔ ڈاکٹر گیان چند نے نسخہ مہیش و مالک رام کا تقابلی مطالعہ کر کے بہت سے اہم امور پر روشنی ڈالی ہے۔ مالک رام کی نیک نیتی اور انجمن کی غیر ذمہ دارانہ روش کا ذکر کیا ہے۔ ان کے خیال میں اس نسخے کو مالک رام کے مرتبات میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے کی اکثر تحریریں شایع ہو چکی ہیں لہٰذا اب اس بحث کو ختم کر دینا چاہیے۔ یوں بھی ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ خطوط غالب نے خطوط غالب کے مجموعوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

'خطوط غالب' کے حواشی میں حوالوں کے لیے مخففات استعمال ہوئے ہیں۔ جن کا ذکر عبدالستار صدیقی نے طبع اول کے مقدمہ میں کیا تھا طبع دوم یہ مقدمہ شامل نہیں اور علیحدہ سے بھی ان مخففات کی فہرست نہیں دی گئی لہٰذا طبع اول کے حواشی کے مخففات اس ایڈیشن میں طلسمات کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ 'خطوط غالب' کا طبع نایاب ہے، طبع دوم کمیاب مگر لائبریریوں میں مل جاتا ہے۔ طبع دوم کے حواشی سے صحیح طور پر استفادہ کیا جا سکے اس لیے سطور ذیل میں طبع اول کے مخففات درج کیے جا رہے ہیں:

۱۔ ع، ع ۱ = عود ہندی کی پہلی اشاعت۔ مطبع مجتبائی۔ میرٹھ۔ اکتوبر ۱۸۶۸ء۔

۲۔ ع ۲ = عود ہندی۔ ناشر علی گڑھ کالج بک ڈپو علی گڑھ۔ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ۔ ۱۹۱۰ء

۳۔ م، م ۱ = اردو معلیٰ۔ اکمل المطابع دہلی مارچ ۱۸۶۹ء

۴۔ م ۲ = " " فروری ۱۸۹۱ء

۵۔ م ۳ = اردو معلیٰ (مع حصہ دوم) مطبع مفید عام، آگرہ ۱۹۱۴ء

۶۔ م حصہ ۲ = اردو معلیٰ (صرف حصہ دوم "

(اس کے صفحات کی گنتی پہلے حصے سے الگ ہے)

۷۔ مکاتیب = مکاتیب غالب۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی۔ مطبع قیمہ بمبئی۔ باراول ۱۹۳۷

۸۔ غ = غالب

۹۔ انتخاب = انتخاب غالب (قلمی نسخہ مملوکہ عبدالستار صدیقی)

آخری مخفف 'انتخاب' کا ذکر مقدمہ میں نہیں آسکا ہے۔ غالباً سہواً ایسا ہوا ہوگا۔ اس نسخے میں میر مہدی مجروح کے نام ۱۲ خط ہیں۔ ایک خط کسی دوسرے مجموعے میں

نہیں ملتا۔ اس نسخے سے ملان کرنے سے خطوط کی بعض محذوف عبارتوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔

خطوط غالب جلد دوم (غیر مطبوعہ): 'خطوط غالب' جلد دوم کے بارے میں جو شواہد دستیاب ہیں، ان کے مطابق جلد اول کی اشاعت (۱۹۴۱ء) کے وقت جلد دوم کا مسودہ تقریباً تیار تھا۔ مقدمہ میں عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے:

ایک ضخیم مجموعہ 'خطوطِ غالب' کے نام سے دو جلدوں میں تیار ہوا۔ پہلی جلد اب شائع ہو رہی ہے اور امید ہے کہ دوسری جلد کا چھاپا بھی اسی سال ہو جائے (مقدمہ ص:۱)

اس بیان سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جلد اول کے ساتھ ہی جلد دوم کا مسودہ بھی اکیڈمی کو سونپ دیا گیا ہوگا دونوں جلدوں کی اشاعت وملکیت کے حقوق بھی اکیڈمی نے مرتب سے ایک ہی بار میں حاصل کیے ہوں گے۔ لیکن جلد دوم کی اشاعت کو اکیڈمی نے ایک لمبے عرصے تک التوا میں رکھا۔ اس کی وجوہ پر مولوی صاحب کے بعض خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔ مرتب کے لگا تار اصرار پر اکیڈمی نے بالآخر ۱۹۴۹ء میں حقوقِ طباعت کا معاہدہ منسوخ کر دیا اور مرتب کو طباعت کا حق دے دیا کہ وہ اپنی مرضی ومنشا سے کتاب جہاں چاہے چھپوا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلد دوم کا مسودہ بھی اکیڈمی نے اشاعت کے معاملات ختم کرنے کے ساتھ ہی مرتب کو واپس کر دیا تھا۔ جلد دوم کی اشاعت کے بارے میں اکیڈمی کے رویے اور مولوی صاحب کی تشویش کا اظہار مالک رام کے نام اسی دور کے ان کے متعدد خطوط میں ہوا ہے۔ خطوط کے اقتباسات طویل ہیں لیکن ان کو نقل کیے بغیر مولوی صاحب کے حقیقی کرب کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

(۱) خطوط غالب کی دوسری جلد کب شائع ہو کچھ پتا نہیں۔ کچھ بس نہیں۔

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

یہ بات آپ نے خوب لکھی ہے کبھی کبھی مجھ پر مایوسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ مواد اِک جا کیا ہے وہ مناسب طور سے مستعمل نہ ہو سکے اور میں ملک عدم پہنچ جاؤں۔ کوئی صاحب اطمینان کے ساتھ سب کچھ سمجھ لیں اور مناسب شرائط کے ساتھ تمام چیزیں مجھ سے لے لیں اور لکھیں تو

اچھا ہوگا۔ میرا جو حال ہے کیا لکھوں۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔
(خط نمبر ۸ مکتوبہ ۳ر مئی ۱۹۴۸ء ۔نقوش مکاتیب نمبر ج ۲۱،
ص ۶۳۸)

۲۔ خطوط غالب کا حصہ اول عرصے سے نہیں ملتا۔ صرف پانچ سو چھپا تھا۔ سو ختم۔ ہندوستانی اکیڈمی نے حصہ اول کو چھاپا۔ جنگ نے 'بعدہ' موقع نہ دیا کہ دوسرا حصہ چھپتا۔ حصہ اول ختم ہے۔ ضرورت تھی کہ دونوں حصے چھپتے ۔مگر حالات ایسے معلوم ہو رہے ہیں کہ اکاڈمی اب نہ چھاپے۔ کیوں کہ کوشش ہندی والوں کی طرف سے سر توڑ یہ ہے کہ اکاڈمی صرف ہندی کتب کے لیے ہی مخصوص رہے۔ 'خطوط غالب' کا حشر کیا ہوتا ہے ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ختم ہو جاؤں اور غالب کا کام ختم نہ کر سکوں۔ جو مواد فراہم کیا ہے وہ ایسا نہیں کہ میرے سمجھائے بغیر اسے کما حقہ کوئی بھی شخص مرتب کر سکے۔

(خط نمبر ۱۴ مکتوبہ ۸ ستمبر ۱۹۴۸ء ۔نقوش ص: ۶۴۳)

(۳) میری کتاب کی اشاعت ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی بدولت ہوئی۔ اب ہندوستانی اکاڈمی آئندہ غالباً ہندی کا ہی کام کرے گی۔ میری کتاب کی طباعت کا حق مجھے دے دیا ہے۔ میں اس فکر میں ہوں کہ کتاب شائع ہو ۔ یہ کام مشکل ہے۔ بہ مشکل پہلے سب کچھ اکھٹا کیا اب طباعت کا معاملہ حل کر دوں......

(خط نمبر ۱۸۔ مکتوبہ ۲۲ر جولائی ۱۹۴۹ء نقوش ص ۶۴۵)

مالک رام نے مذکورہ حالات کو دیکھتے ہوئے ان کے کام کی نقل محفوظ کر لینا چاہی اس پر انہیں لکھا: جب کہ آپ تمام مواد کی نقل کے لیے خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں تو تمام

مواد ہی مناسب معاوضہ سے کیوں نہ لے لیں۔'' (خط نمبر ۲۷ سنہ ندارد)

پروفیسر مختارالدین آرزو نے علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء انہیں بھیجا ہوگا۔ پارس کی اشاعت کے متعلق انہیں کچھ لکھا ہوگا۔اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

> خطوط غالب ممکن ہے کہ اکاڈمی نہ شائع کرے نہ کر کے (کذا) ایسی حالت میں کیا مسلم یونیورسٹی چھاپنے کے لیے تیار ہوگی؟۔متن دو حصوں پر مشتمل ہے۔دو حصوں میں مقدمہ مرزا کا حال و مکتوب الیہم وغیرہ کے حالات ہوں گے۔میرے خیال سے بعض حواشی کا ہونا بھی مناسب ہے۔
>
> (خط نمبر ۱۶ مکتوبہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۸ء نقوش ص ۶۴۴)

آرزو صاحب کے نام اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جلد دوم پر مقدمہ بھی لکھا گیا تھا۔جو دو حصّوں پر مشتمل تھا۔حصہ اول میں مرزا کے احوال تھے اور دوسرے حصے میں مرزا کے مکتوب الیہم کے کوائف۔مجھے ایسا لگتا ہے کہ جلد اول کا دیباچہ بھی دونوں جلدوں کے لیے لکھا گیا تھا۔اس میں بعض ان مکتوب الیہ کے نام،خطوط اور ماخذات کا ذکر آیا ہے جو جلد اول میں شامل نہیں۔دیباچے کے وہ بیانات جو جلد اول سے کسی طور بھی مطابقت نہیں رکھتے۔سطور ذیل میں اُن کی طرف نشاندہی کی جارہی ہے:

(۱) عبدالجمیل جنون بریلوی (تلمیذ غالب) کے فرزند قاضی محمد خلیل حیراں بریلوی سے عزیز الدین عزیز وصادق کے مطبوعہ خط کی نقل مل گئی اس سے اردوے معلٰی وعود ہندی میں شامل خط کی تصحیح ہوئی۔(ص: ط ی)

(۲) قاضی عبدالودود بیرسٹر پٹنہ کی توجہ سے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے نام ۶ خط ملے،جن میں پانچ جلوہ خضر میں اور ایک رسالہ ندیم (گیا) میں شائع ہوا تھا۔(ص ط ی)

(۳) عبدالرحمن تحسین پانی پتی (تلمیذ غالب) کے نام خطوط اور ان کے کلام پر اصلاحوں کا کچھ حصہ رسالہ حیات نو (اپریل ۱۹۳۴ء) میں چھپا تھا۔تمام خطوں اور اصلاحوں کی نقلیں خواجہ سجاد حسین (ابنِ حالی) اور محمد بدر الاسلام فضلی (مدیر حیات نو) کی عنایت سے ملیں۔ڈاکٹر خلیق انجم نے جلد ۴ میں ان خطوط کو شامل کرلیا ہے۔خلیق انجم کو ان خطوط کی نقلیں

مولوی صاحب کے کاغذات سے ملیں۔انہوں نے حرفِ آغاز میں اعتراف کیا ہے:

مجھے مولوی مہیش پرشاد مرحوم کے ان کاغذات میں (جو انجمن ترقی اردو (ہند) کی ملکیت میں) عبدالرحمٰن تحسین کے نو خطوط کی نقلیں مل گئیں۔یہ تمام خطوط پانی پت کے غیر معروف رسالے سہ ماہی 'حیات نو' میں شایع ہوئے تھے۔

(غالب کے خطوط ج ۴، ص:۱۴۰۹)

(۴) ڈاکٹر پریم نرائن بھٹنا گر سے بے صبر کے کلام پر اصلاحیں ملیں (ص: ک)

(۵) سید محمد عثمان ابدالی افشاں سے صوفی منیری کے کلام پر اصلاح کی نقول ملیں (ص: اک) اصلاحو کے بارے میں مرتب نے دیباچے ہی میں یہ اطلاع دی ہے کہ ''یہ سب اصلاحیں دیباچوں، تقریظوں وغیرہ کے ساتھ 'خطوطِ غالب' کی دوسری جلد میں شامل ہیں''۔(ص: اک) اسی کے ساتھ رسائل کے متعلق حسبِ ذیل نوٹ اہم ہے:

۲۔متعدد اردو رسالوں میں غالب کے خط شائع ہوتے رہے ہیں۔جن میں سے خاص کر ذکر کے قابل یہ ہیں: فصیح الملک'، اردو'، ہندوستانی (الہ آباد)' معارف'، مرقع اور خیابان (لکھنؤ)' ندیم (گیا) حیات نو (پانی پت)' جرنل ہسٹاریکل سوسائٹی (لکھنؤ)۔میں نے ان سب رسالوں سے فائدہ اٹھایا جس کے لیے میں ان کے مضمون نگاروں اور ایڈیٹروں کا ممنون ہوں۔

(دیباچہ: ص: ک)

رسالہ اردو اور ہندوستانی کے علاوہ باقی رسائل کے جلد اول میں حوالے نہیں آئے۔ان کا تعلق جلد دوم ہی سے ہے۔اِن رسائل کی کن اشاعتوں میں غالب کے خطوط طبع ہوئے۔اس کی دستیاب معلومات سطورِ ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

معارف: (اعظم گڑھ) اس میں تین افراد کے نام خطوط کی اشاعت میرے علم میں ہے۔
(۱) صوفی منیری (نومبر ۱۹۲۰) (۲) علاؤالدین احمد خاں علائی (دسمبر ۱۹۲۲ء) (۳) ضیاء الدین خاں ضیاء (مارچ ۱۹۲۷)

مرقع: سے مراد غالباً مرقع عالم ہردوئی ہے۔یاد پڑتا ہے اس میں غالب کے بارے میں

ایک مضمون چھپا تھا۔ جو بار دگر معیار پٹنہ میں نقل ہوا۔ حوالے کا سر دست علم نہیں۔

خیابان: (لکھنؤ) اس کے مرتب کا ایک مضمون بہ عنوان ''گنج پنہاں۔ مرزا غالب کے دو غیر مطبوعہ خطوط'' نومبر ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شامل ہوا تھا۔ خط کس کے نام تھے۔ سر دست علم نہیں۔

ندیم: (گیا) دیباچہ کی صراحت کے مطابق اس میں صفیر بلگرامی کے نام ایک خط شائع ہوا تھا۔ یہ شمارہ اغلباً بہار نمبر ۱۹۳۵ء رہا ہوگا۔

حیات نو (پانی پت) ڈاکٹر خلیق انجم کی تصریح کے مطابق یہ رسالہ ۱۹۳۳ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے ہر شمارے میں غالب کا ایک خط شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر محمد بدر الاسلام فضلی تھے۔ سرورق پر حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین کا نام بھی ہوتا تھا۔ اس رسالے کی مختلف اشاعتوں میں عبدالرحمٰن تحسین کے نام غالب کے غیر مطبوعہ ۹ خطوط چھپے تھے۔ (غالب کے خطوط ج ۲/ص: ۹۶۳، ۹۶۴)

جنرل ہسٹاریکل سوسائٹی: (لکھنؤ) اس کے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔

دیباچہ میں ۹ افراد کا ایک جگہ، ۱۲ افراد کا دوسرے مقام پر شکریہ ادا کیا گیا ہے، جنھوں نے غالب کے خطوط کی نقول مقابلے کے لیے عنایت کیں۔ ان ۲۱ افراد کے علاوہ ۱۴ افراد کا مزید شکریہ ادا کیا گیا ہے جن سے دوسرے امور میں مدد ملی۔ ممکن ہے ان میں سے بعض افراد کا تعلق جلد دوم کے مواد سے ہی ہو۔ ان میں فرزند حالی خواجہ سجاد حسین، حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولوی عبد الحق، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، آغا محمد اشرف دہلوی جیسے افراد کے نام نظر آتے ہیں۔

مواد سے متعلق مذکورہ بالا اطلاعات کا تعلق بدیہی طور پر جلد دوم سے ہے۔ ان اطلاعات کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ دیباچہ کا تعلق دونوں جلدوں سے تھا اور دونوں جلدوں کی اشاعت بھی ایک ہی سال کے اندر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہونا طے پا گئی تھی۔ بعد میں جلد دوم التوا کی نذر ہو کر بالآخر ضائع ہو گئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب سے متعلق مولوی صاحب کے جمع کیے گئے مواد اور ترتیب دیے گئے مسودات کا حادثوں سے گزرنا طے پا چکا تھا۔ مولوی صاحب کی زندگی ہی

میں بغیر ان کی اجازت کے 'خطوط غالب جلد اول' کا نصف حصہ انوار بک ڈپو لکھنؤ'' نے غالب کے خطوط'' کے نام سے شایع کر دیا تھا (یہ غالباً سید توسل حسین کے نام کی ترتیب سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا) جس پر مولوی صاحب نے سخت احتجاج کیا اور بک ڈپو پر نالش کردی۔ ۱۹۴۹ء کے اواخر میں بک ڈپو کے مالک سے صلح ہو گئی۔ صلح کن شرائط پر ہوئی اس کے بارے میں پتا نہیں چلتا۔ (خط نمبر ۲؛ بنام مالک رام مکتوبہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۱ 'نقوش مکاتیب نمبر ۶۴۷)

مولوی صاحب کی وفات کے بعد ہندوستانی اکیڈمی نے غالب کے خطوط کو باردگر دو جلدوں میں شائع کرنے کا ایک اور منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت غالب کے خطوط کو ہندی میں ''غالب کے پتر'' نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ جلد اول ۱۹۵۸ء میں طبع ہوئی۔ جو دراصل ''خطوط غالب'' کی ہندی قرأت (version) یا ترجمہ کی صورت اختیار کر گئی اس کے مرتبین شری رام شرما اور رام نواس شرما تھے۔ جلد اول کے دیباچے میں مرتبین نے اعتراف کیا کہ اس میں اکیڈمی کی شائع شدہ اردو کتاب 'خطوط غالب' مرتبہ مہیش پرشاد کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسری جلد کے مرتب تنہا شری رام شرما ہیں۔ یہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی اس کا متن خطوط کے دوسرے مجموعوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ ۱۹۶۳ء ہی میں خطوط غالب کا دوسرا ایڈیشن انجمن نے شائع کیا جس پر غلطی سے مالک رام کا نام درج ہو گیا۔ اور ''خطوط غالب'' نسخہ مالک رام کے نام سے معروف ہوا۔

مولوی صاحب کی وفات (۱۹۵۱ء) کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے ان کے مسودات اور کاغذات مولوی صاحب کے اعزا سے قیمتاً حاصل کر لیے۔ ان کاغذات میں عبدالستار صدیقی کی نظر ثانی شدہ 'خطوط غالب' کی دونوں جلدیں اور دوسرے مسودات تھے۔ انجمن سے یہ کاغذات و مسودات چوری ہو گئے۔ لیکن چوری ہونے کا واقعہ غالب صدی ۱۹۶۹ء یا اس کے بعد کا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ کے دو بیانات نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے خطوط غالب جلد دوم کے تعارف میں لکھا ہے:

تکمیل سے پہلے مولوی مہیش پرشاد کا انتقال ہو گیا۔ انجمن ترقی اردو ہند نے وارثوں سے سارے کاغذ خرید لیے۔ مسودہ انجمن

سے گم ہو گیا۔ بدگمان کہتے تھے کہ کچھ کاغذ مولانا خیر بہوروی کو ملے اور باقی جناب مالک رام کی تحویل میں پہنچے۔ واللہ اعلم
انجمن کے دفتر (علی گڑھ) میں مولوی مہیش پرشاد کے کاغذ جن میں غالب کے بعض شاگردوں کی تصویریں اور احوال بھی تھے۔ جستہ کے ایک بڑے صندوق میں رکھے تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور کے حکم سے ۶۹۔۱۹۶۸ء میں راقم نے ایم جیب خاں کے تعاون سے ان کی فہرست تیار کر کے اسی صندوق میں رکھوادی تھی۔ پھر ان کاغذوں پر جو گزری اس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

(غالب ببلیوگرافی طبع دوم ص:۱۷۳)

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

مولوی مہیش پرشاد نے غالب کے شاگردوں اور مکتوب الیہم کی تصاویر اور ان کے حالات جمع کیے تھے۔ ان کے وہ سب کاغذ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ تھے۔ کہتے تھے کہ اُن میں سے کوئی آدھے کاغذ مالک رام کے قبضے میں آگئے تھے۔ حقیقت حال کا علم تو عالم الغیب ہی کو ہے (ایضاً ص:۶۴)

چوری کے اس واقعے میں ڈاکٹر انصار اللہ نے مالک رام کو جس طرح متہم کیا ہے اس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔ مالک رام کے وہ کام جن کے ماخذ یا معاون ماخذ مہیش پرشاد کے مسودات بن سکتے تھے، چوری کے اس واقعے سے بہت پہلے شائع ہو چکے تھے۔ میری مراد تلامذہ غالب طبع اول ۱۹۵۷ء اور خطوط غالب طبع دوم ۱۹۶۲ (صحیح ۱۹۶۳ء) سے ہے۔ جن دنوں مالک رام خطوطِ غالب کا نسخہ انجمن کے لیے تیار کر رہے تھے (یہ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۷ء کی بات ہے) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے مولوی مہیش پرشاد کی مرتبہ دونوں جلدوں کے مسودات انجمن سے مالک رام کو دلوا دیے تھے تاکہ وہ مولوی صاحب کی جملہ تحقیقات کو

اپنے سامنے رکھ سکیں۔ یہ اطلاع بھی خود عبدالستار صدیقی نے اپنے ایک خط مکتوبہ ۸/اپریل ۱۹۶۵ء بنام عقیل حسن موسوی (کراچی) میں دی ہے۔ (اردو تحقیق اور مالک رام ص ۱۲۴ بحوالہ غالب شناس مالک رام ص: ۱۳۴) مالک رام نے صرف جلد اول کو تیار کیا جلد دوم کو کیوں نہیں تیار کیا، اس کا مسودہ انجمن کو واپس کیا یا نہیں۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا

مولوی صاحب کے مضامین: مولوی صاحب کے مضامین کی فہرست یہاں پیش کرنے کا منشاء صرف یہ ہے کہ غالب پر ان کی نظر وسعت کا اندازہ ان کے مضامین کے عنوانات سے بھی لگایا جا سکے۔ ان کا جملہ کام غالب شناسی کی تحقیقی روایت کے دورِ اول سے تعلق رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان مضامین کو تلاش کر کے ترتیب دیے جائیں تا کہ ان کی تحقیقی خدمات کا صحیح اعتراف ہو سکے:

ا۔ مرزا غالب کے اردو خطوط خیابان لکھنؤ نومبر ۱۹۳۳ء

۲۔ رقعات غالب میں کانٹ چھانٹ (عود اور اردو کا فرق) زمانہ کانپور جنوری ۱۹۳۴ء

۳۔ باردگر ادبی دنیا لاہور مارچ ۱۹۳۴ء

۳۔ مرزا غالب کے کثیر التعداد گم شدہ خطوط خیابان لکھنؤ جون ۱۹۳۴ء

۴۔ مرزا غالب کے فارسی خطوط فطرت ستمبر ۱۹۳۴ء

۵۔ غالب کی اصلاح ایک مثنوی لواء الحمد پر ہندوستانی الہ آباد جنوری ۱۹۳۵ء

باردگر رسالہ ہندوستانی کا انتخاب اردو ادب پٹنہ ۱۹۹۳ء

۶۔ غالب کی خود نوشت ترجمانی خیابان لکھنؤ جنوری، فروری ۱۹۳۵

۷۔ مرزا غالب اور خطوط کی تاریخیں الناظر لکھنؤ فروری ۱۹۳۵ء

۸۔ مرزا غالب کا ایک غیر معروف خط بنام ولایت علی زمانہ کانپور مئی جون ۱۹۳۵ء

۹۔ عود ہندی کی ترتیب ہندوستانی الہ آباد اکتوبر مئی، جون ۱۹۳۵ء

باردگر رسالہ ہندوستانی کا انتخاب اردو ادب پٹنہ ۱۹۹۳ء

۱۰۔ مثنوی ابر گہر بار خیام لاہور فروری ۱۹۳۸ء

باردگر زمانہ کانپور فروری ۱۹۴۰ء

۱۱۔ دیوان غالب اردو قلمی نسخے، بارِ دگر۔ زمانہ کی غالبیات، پٹنہ ۱۹۹۴ء (چار مخطوطے) زمانہ

کانپور، فروری ۱۹۴۰ء

۱۲۔ دستنبو غالب ادبی دنیا لاہور نومبر ۱۹۴۱ء

۱۳۔ غالب کی زندگی میں اردو کلام کی اشاعت زمانہ کانپور اگست ۱۹۴۲ء

۱۴۔ مرزا غالب کے ایام میں نظام ڈاک نوائے ادب بمبئی جنوری ۱۹۵۱ء

۱۵۔ خطوط بنام غالب مع جوابات اردو ادب علی گڑھ جنوری تا اپریل ۱۹۵۱ء

۱۶۔ تصانیف مرزا غالب کی ابتدائی اشاعتیں سب رس حیدر آباد جون ۱۹۵۱ء

۱۷۔ مرزا غالب اور ان کا طرز املا ادیب علی گڑھ مارچ اپریل ۱۹۶۳ء

۱۸۔ غالب اردو اس طرح لکھتے تھے۔ سب رس حیدر آباد نومبر ۱۹۶۳ء

مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ بھی اور مضامین بھی ہو سکتے ہیں جن کی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔

آج متنی تنقید کے اعلیٰ درجے کے تدوینی نمونے دستیاب ہیں۔ مولانا عرشی اور رشید حسن خاں مرحوم نے ترتیب و تدوین کے فن کو عروج کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن اس وقت جب تدوین متن کے اصول باضابطہ طور پر طے نہیں تھے۔ مولوی مہیش پرشاد نے اس سمت پیش قدمی کی اور 'خطوط غالب' کا ناقدانہ نسخہ مرتب کرنے میں جس بے پناہ محنت' دیدہ ریزی اور دیدہ سوزی کا ثبوت دیا وہ کسی کارنامے سے کم نہیں۔ انہوں نے اپنی تلاش و تحقیق کو صرف خطوط تک محدود نہیں رکھا بلکہ غالب کے احوال، تصانیف، تلامذہ پر بھی امکان بھر نظر رکھی۔ انہیں ماہر غالبیات تسلیم کیا جائے یا نہیں لیکن غالب شناسی کی جو جوت انہوں نے اپنے عہد میں جگائی تھی اور اپنی تحریروں کے ذریعے غالب کے مطالعے کو جو جہت دی۔ اس کا اعتراف ہمیں بہر حال کرنا چاہیے۔

حواشی:

۱۔ مالک رام کے نام خط محررہ ۲۲ر جولائی ۱۹۴۹ء میں لکھتے ہیں:

غالب کی جو اصل تحریریں میرے پاس جمع ہیں ان کا بلاک تیار کرا کر ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں، تا کہ ان کی تحریروں کے نمونے بذریعہ عکس لوگوں کے پاس

رہیں، اور اصلی تحریریں کہیں (اور) محفوظ رہیں۔ اگر چہ پچھلے ایام میں غالب کی کافی تحریریں شائع ہوئی ہیں پھر بھی میرے پاس کچھ ایسی ہیں جو کہ ابھی شائع نہیں ہوئیں اور ہنوز میرے پاس محفوظ ہیں۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ (نقوش ص ۶۴۵)

۲۔ اسی خط میں اس کتاب کی اطلاع دیتے ہیں۔

غالب کے نام جو خطوط مختلف حضرات کے ہیں ان کا مجموعہ بھی چھوٹا سا تیار ہو گیا ہے۔ ایسے مجموعے میں کچھ خط از مرزا بطور جواب یا جواب الجواب ٹھہرتے ہیں۔ (نقوش ص: ۶۴۵)

۳۔ خیابان لکھنؤ اور شاعر آگرہ میں مطبوعہ اس اپیل کا عکس ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس) کے ذاتی ذخیرے سے ملا۔ اس عنایت کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۴۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے دیوان غالب، کو تاریخی ترتیب سے مدون کیا جو ۱۹۲۸ء کے قریب مکمل ہو کر حیدر آباد میں چھپنا شروع ہو گیا۔ ابھی ایک سو چھبیس ۱۲۶ صفحے چھپے تھے کہ مطبع میں آگ لگ گئی۔ دیوان کا مسودہ اور مطبوعہ اوراق جل کر راکھ ہو گئے۔ کسی طرح اس کا کچھ مطبوعہ حصہ سید تمکین کاظمی کے قبضے میں آیا جسے انہوں نے عرشی صاحب کی نذر کر دیا۔ عرشی صاحب نے دیوان غالب نسخہ عرشی کے مقدمہ میں ماخذ کے طور پر اس حصے کا بھی ذکر کیا ہے۔

۵۔ خطوط غالب جلد اول نایاب ہے۔ حکیم سید ظل الرحمٰن (علی گڑھ) نے از راہِ علم دوستی ابن سینا اکیڈمی سے (جو ان کا اپنا قائم کیا ہوا ادارہ ہے) جاری کرا کر مجھے بریلی بھیج دی۔ جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

۶۔ استدراک سے ڈاکٹر گیان چند نے یہ سمجھا ہے کہ جلد اول مطبوعہ پر عبدالستار صدیقی نے نظر ثانی کی ہوگی (غالب شناس مالک رام ص: ۱۴۰) یہ خیال درست نہیں۔ انہوں نے جلد اول و دوم کے مسودات پر نظر ثانی کی تھی۔ جس کا ثبوت کتاب میں موجود ان کے حواشی اور متن کا قائم کیا ہوا املا ہے۔

۷۔ گیان چند جین نے نسخہ مہیش اور مالک رام کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے نسخہ مہیش کے بارے میں لکھا ہے:

''(۲) بعض حواشی مہیش پرشاد کے لکھے ہوئے ہیں (۳) زیادہ
تر حواشی عبدالستار صدیقی کے ہیں اور ان کے آخر میں 'ع ص' یا
'مصحح' لکھا ہوا ہے (غالب شناس مالک رام ص:۱۴۳) مذکورہ
تعداد ملاحظہ فرمانے کے بعد گیان چند کے اس بیان کی بابت کیا
کہا جائے گا؟''

۸۔ غالب کے خطوط ج ۱ حرف آغاز طبع دوم۔ لیکن گیان چند نے لکھا ہے:

''منشی جی کے جملہ کاغذات ہندوستانی اکیڈمی نے خرید لیے
جس میں ان کی مرتبہ دوسری جلد کا مسودہ بھی تھا ہندوستانی
اکیڈمی انجمن کے حق میں دست بردار ہوگئی۔''

(غالب شناس مالک رام ص:۱۲۰)

۹۔ یہ بیان پیش کردہ معلومات کی روشنی میں غلط ہے۔ اسی طرح کا ایک بیان ڈاکٹر خلیق انجم کا بھی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''مولوی مہیش پرشاد نے غالب کے تمام اردو خطوط اور نثر دو
جلدوں میں مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ صرف پہلی جلد
مرتب کر سکے جو ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع
ہوئی۔''

(مقدمہ، غالب کی نادر تحریریں ص:۲۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۶۹۔۱۹۶۸ء میں جب ڈاکٹر انصار اللہ نے مولوی مہیش پرشاد کے کاغذات کی لسٹ بنائی تھی اس میں خطوطِ غالب جلد دوم کا مسودہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے یہ اس وقت تک مالک رام کی تحویل میں رہا ہوگا۔ اور یہ انجمن کو واپس نہیں کیا گیا ہوگا۔

کتابیات:

۱۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے اردو مصنفین، ڈاکٹر سنجیدہ خاتون، بھارت آفسیٹ، دہلی ۲۰۰۴ء

۲۔ تذکرۂ ماہ و سال، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۸۴ء

۳۔ خطوط غالب، ج ۱، مولوی مہیش پرشاد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۴۱ء
۴۔ خطوط غالب ج ۱، مالک رام، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۳ء
۵۔ غالب، ڈاکٹر سید عبدالطیف، آرٹ پریس، حیدر آباد ۱۹۳۲ء
۶۔ غالب ببلیوگرافی، ڈاکٹر محمد انصاراللہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۷۲ء، اول
۷۔ غالب ببلیوگرافی، "غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۱۹۹۸ء دوم
۸۔ غالب شناس مالک رام، پروفیسر گیان چند جین، غالب اکیڈمی، دہلی ۱۹۹۶ء
۹۔ غالب کی نادر تحریریں، ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی ۱۹۶۱ء
۱۰۔ غالب کے خطوط ج ۱، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۹۳ء

" ج ۲ " " "۱۹۸۵ء

" ج ۳ " " "۱۹۸۷ء

" ج ۴ " " "۱۹۹۳ء

۱۱۔ کچھ غالب کے بارے میں حصہ دوم، قاضی عبدالودود، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۵ء

خیابان لکھنو نومبر ۱۹۳۳ء

شاعر آگرہ جنوری ۱۹۳۴ء

نقوش ج ۱ لاہور (آپ بیتی نمبر) جون ۱۹۶۴ء

نقوش ج ۲ لاہور (مکاتیب نمبر) نومبر ۱۹۵۷ء

ہماری زبان، دہلی (مہیش پرشاد از ویریندر پرشاد سکینہ) یکم اگست ۱۹۹۵ء

یعقوب یاور

غالِب، بنارس اور مثنوی چراغِ دیر

(۱)

۲۸ سال کے جوان العمر مرزا اسداللہ خاں غالب نے ۱۸۲۵ء میں اپنی خاندانی پنشن کی بازیافت کی کاوشوں کے تسلسل میں کلکتہ کا سفر کیا۔ اس دوران وہ بھرت پور، فیروز پور، فرخ آباد، کانپور، لکھنو، باندہ اور الہ آباد کی خاک چھانتے ہوئے ۱۸۲۶ء کے اواخر میں بنارس بھی آئے۔ الہ آباد سے بنارس کا سفر انہوں نے بذریعہ کشتی طے کیا۔ یہاں تقریباً ایک ماہ قیام کیا اور پھر کشتی کا انتظام نہ ہو پانے کے سبب بے دلی سے خشکی کے راستے عظیم آباد (پٹنہ) کے لیے روانہ ہوگئے، جہاں سے مرشد آباد ہوتے ہوئے وہ فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ غالب کا قیام بنارس اپنے اندر کئی اسرار کا امین ہے جس پر سے محققین کی کوششوں کے باوجود ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ یہاں شاہراہ عام پر نہ چلنے کا عادی غالب اپنے مزاج اور رکھ رکھاؤ کے خلاف ایک معمولی سرائے اورنگ آباد (بقول غالب نیرنگ آباد نو رنگ آباد) میں اترتے ہیں اور پانچ دن قیام کرنے کے بعد اسی سرائے کی پشت پر ایک ایسی بڑھیا کا معمولی سا مکان کرائے پر لے کر رہتے ہیں جس کے پاس بقول خود غالب کے چراغ کے لیے تیل تک میسر نہ تھا اور جو کسی بخیل کی قبر سے بھی زیادہ تنگ تھا۔ اس وقت ان

کے پاس پیسے کی کمی رہی ہو ایسی بات نہیں ہے۔قرض کے ہی سہی وہ باندہ سے دو ہزار روپے لے کر آگے کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔اپنے اس بظاہر بے سبب طویل قیام کے دوران وہ یہاں کی کسی قابل ذکر شخصیت سے ملے ہوں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔حیرت کی بات یہ ہے کہ قیام بنارس کی واحد شہادت خود مرزا کے خطوط ہیں۔بنارس سے متعلق تاریخ کی کسی بھی کتاب میں ان کی آمد کا نہ تو ذکر ہے نہ دوسری تفصیلات۔ہاں کچھ قصے کہانیاں ضرور ہیں جو بہت بعد میں گڑھی گئی معلوم ہوتی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ غالب کی بنارس آمد اور قیام کو کسی مورخ نے لائق توجہ نہیں گردانا۔وہ یہاں ایک اجنبی کی طرح نہایت خاموشی سے آئے ،رہے اور آگے کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ممکن ہے غالب نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو کہ لوگ اس شہر میں ان کی آمد اور موجودگی سے بے خبر رہیں۔شاید انہیں یہاں خاطر خواہ پذیرائی کی امید نہ رہی ہو۔شاید الہ آباد میں رونما ہونے والے واقعات نے انہیں مردم بیزار بنا دیا ہوا ور کسی اجنبی سے ملنا انہیں خوفزدہ کر رہا ہو۔یا کچھ محققین کے خیال کے مطابق نوجوان غالب کسی حسین معشوقہ کی زلف گرہگیر کے اسیر ہو گئے ہوں ،ایک شبہ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ سرے سے اس شہر میں آئے ہی نہ ہوں اور مثنوی اور وہ خطوط جن میں اس شہر کی قصیدہ خوانی ہے وہ غالب کی دروغ بیانی کا ادنیٰ کرشمہ ہو، جسے انہوں نے یہاں سے گذرتے ہوئے غائبانہ قلم بند کر لیا ہو۔لیکن غالب کا یہاں سرے سے نہ آنا قرین عقل نہیں معلوم ہوتا۔یہ بے حد کمزور شبہ ہے۔کیونکہ غالب نے بنارس خصوصاً اورنگ آباد سرائے اور اس کے آس پاس کا منظر جس طرح بیان کیا ہے وہ غائبانہ ممکن نہ تھا۔غالب نے اس شہر کی تعریف میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔اس شہر کے تقدس ،قدرتی حسن اور خوش اخلاقی کا قصیدہ تو ان کی مثنوی چراغ دیر اور احبا اور اقربا کو لکھے گئے مختلف خطوط ہیں ہی ،ادبی اعتبار سے بھی یہ شہر ان کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔یہ ان کے روحانی استاد شیخ علی حزیں کا شہر تھا۔انہیں یہاں کے عمایدین سے ملنا چاہیے تھا۔اس کے علاوہ بھی یہاں اس وقت ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جن سے وہ مختلف وجوہ کی بنا پر ملنا پسند کرتے۔غالب کی آمد کا زمانہ بنارس میں امن وامان کا زمانہ تھا۔لوگ اطمینان اور سکون سے اپنے اپنے کاموں میں منہمک تھے۔انگریزوں کے اقتدار کا عمل مکمل ہوئے یہاں کافی عرصہ ہو چکا تھا۔اور مقامی مہاراجا اُدت نارائن سنگھ اس

حقیقت کو نہ صرف تسلیم کر چکے تھے بلکہ ایک طرح سے وہ انگریزوں کا ہی انتخاب تھے ۔اسرار کی ان تہوں کو ممکن حد تک کریدنے کے لیے غالب کی نفسیات، صحت، ہندوستان میں سیاست کا بحرانی دور اور اس وقت کے بنارس کے سماجی، سیاسی، مذہبی اور ادبی حالات کی واقفیت ضروری ہے۔ اس مختصر مقالے میں ایسی ہی کچھ تفصیلات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو شاید آنے والے محققین کے لیے چراغ راہ ثابت ہوسکیں۔

غالب کے سفر کلکتہ کا یہ عہد جہاں ایک طرف دہلی میں سیاسی طور پر ہنگامہ آرائی اور انقلابی تبدیلیوں کا تھا وہیں بنارس میں ان ہنگاموں کے بعد کا سکوت طاری تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہاں چاروں طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ جب غالب ۱۸ر نومبر ۱۸۲۵ء کو دہلی سے نواب احمد بخش کی معیت میں مٹکاف سے ملاقات کی غرض سے ان کی فوج کے ہمراہ بھرت پور کے لیے نکلے تھے، تو شمالی ہندوستان اور دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اور غاصبانہ سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ یہاں کے بیشتر علاقے ان کی تحویل میں آ چکے تھے۔ اور اب ان کی بری نگاہ تخت دہلی پر مرکوز تھی لیکن اس کام میں ابھی ایک آنچ کی کسر باقی تھی اور اس کے لیے انگریز ابھی مناسب وقت اور حالات کے اپنے حق میں ساز گار ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ دوسری طرف دہلی میں ہی نہیں سارے ہندوستان میں اجتماعی دفاعی لائحہ عمل کا فقدان تھا۔ مرکز کمزور تھا اور سارا ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر حکمراں کی نظر میں وطن کی حفاظت کا مفہوم صرف اپنی ریاست کی حفاظت تھا اور ہر شخص اس کے لیے کوشاں بھی تھا لیکن یہ چھوٹے چھوٹے راجا مہاراجا اور نواب اپنی چھوٹی چھوٹی فوجوں کی مدد سے انگریزوں کی بے پناہ طاقت کے سامنے بے بس تھے۔ جن علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا وہاں تو ان کی حکمرانی تھی ہی لیکن جہاں ابھی یہ کام ہونا باقی تھا وہاں کے صاحب اقتدار لوگ کسی بھی وقت معزول کر دیے جانے کے خوف کے سائے میں مقامی ریزیڈنٹوں کی ناز برداری کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اپنی حکومت کا نظم چلا رہے تھے۔ انہیں میں دہلی کا بدنصیب بادشاہ اکبر شاہ ثانی بھی تھا۔ اگر چہ اورنگزیب کے بعد سب سے زیادہ دنوں تک تخت پر بیٹھے رہنے کی خوش نصیبی انہیں کے حصے میں آئی تھی لیکن ان کے روزمرہ کا کام انگریزوں کی پنشن سے چل رہا تھا۔ ان

کی تمام سرگرمیاں اور حکمت عملی اپنے لیے مزید مراعات حاصل کرنے تک محدود تھیں۔ایسے میں رعایا کی فکر کون کرتا۔چنانچہ دہلی کے دوسرے پریشان حال لوگوں کی طرح غالب بھی اپنے روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل میں مصروف تھے۔ان کاموں میں ان کی اپنی خاندانی پنشن کے حصول کی تگ ودو بھی شامل تھی،جس کے وہ جائز طور پر مستحق تھے لیکن جو بدخواہوں کی بری نظر کا شکار ہو چکی تھی۔منظور شدہ دس ہزار روپے سالانہ کی پنشن بددیانت سرپرستوں کے طفیل پہلے تو پانچ ہزار قرار پائی۔بعدہ،اس کی تقسیم میں چالیس فیصد یعنی دو ہزار روپے سالانہ پہنچ رہی تھی اس ناانصافی کے ازالے کے لیے وہ دہلی کے ریزیڈنٹ چارلس مٹکاف سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔وسیلے کے طور پر انہوں نے نواب احمد بخش کی مدد لی جوان کی سادہ لوحی پر دلالت کرتا ہے۔اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہی نکلا۔نواب احمد بخش غالب کو مٹکاف سے ملوانا نہیں چاہتے تھے۔اور جب تک غالب کو یہ بات سمجھ میں آتی مٹکاف کہیں کا کہیں پہنچ چکا تھا۔اور وہ فیروز پور میں بیٹھے احمد بخش کا انتظار کر رہے تھے۔

مایوس ہو کر غالب نے خود اپنے طور پر مٹکاف سے ملاقات کا تہیہ کیا۔انہیں معلوم ہوا کہ وہ جلد ہی کانپور پہنچنے والا ہے۔انہوں نے بغیر وافر زادسفر کے کانپور جانے کا ارادہ کر لیا۔شاید دہلی ہوتے ہوئے کانپور جانا ان کے لیے اس لیے ممکن نہ رہا کہ وہ قرض خواہوں سے بچنا چاہتے تھے جواب اس امید میں تھے کہ غالب کو ان کی پنشن مل جائے اور ان کا قرض وصول ہو۔فرخ آباد کے راستے غالب کانپور پہنچے تو سخت علیل ہو گئے۔اتنے بیمار کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔کانپور میں علاج کی سہولتوں کا فقدان کہیے یا لکھنو سے کچھ یافت کی امید،وہ لشتم پشتم کانپور سے لکھنو پہنچے۔وہاں چند در چند وجوہ کی بنا پر ان کی مراد تو پوری نہ ہو سکی لیکن انہیں علاج کی سہولت میسر آ گئی۔چارلس مٹکاف کانپور آئے بھی اور گئے بھی لیکن لن سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔اس ناکامی کے بعد غالب کلکتہ جانے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔تاکہ وہاں براہ راست گورنر جنرل سے ملاقات کر کے اپنی عرض داشت پیش کر سکیں۔یہاں انہیں باندہ کے نواب ذوالفقار علی بہادر کی یاد آئی جن سے ان کے دیرینہ خاندانی مراسم تھے۔انہیں یقین تھا کہ نواب باندہ نہ صرف ان کا خاطر خواہ علاج کرا دیں گے بلکہ ان کے کلکتہ جانے کا بندوبست بھی کر دیں گے۔انہوں نے

سوچا کہ وہ کچھ دن باندہ میں آرام کرنے کے بعد سیدھے کلکتہ جا کر اپنی پنشن جاری کرانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ وہ فوراً کانپور کے لیے روانہ ہو گئے اور وہاں سے فتح پور ہوتے ہوئے باندہ پہنچ گئے۔ یہاں کے طویل قیام میں بہتر علاج اور تیمارداری کا ان کی صحت پر خوشگوار اثر پڑا۔ اب وہ اپنے اندر نیا حوصلہ محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے نواب باندہ کی وساطت سے ایک مہاجن سیٹھ امین چند سے دو ہزار روپے کا قرض لیا اور کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

باندہ سے روانہ ہوتے وقت ان کا ارادہ چلہ تارا کے پاس سے، جو جمنا کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، دریائے جمنا عبور کر کے فتح پور جانے کا تھا۔ وہاں سے خشکی کے راستے الہ آباد جانے والے تھے۔ لیکن جس بیل گاڑی سے وہ چلہ تارا کے لیے روانہ ہوئے تھے شاید اس کی سست رفتاری نے ان کو اپنے منصوبے پر نظر ثانی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہاں انہوں نے اپنے پروگرام میں دو نمایاں تبدیلیاں کیں۔ اول یہ کہ اب ان کا ارادہ فتح پور جا کر خشکی کے راستے سفر کرنے کا نہیں رہا۔ اس کے بجائے انہوں نے دریائے جمنا میں بذریعہ کشتی سفر کو ترجیح دی۔ کشتی سے سفر کرنا خشکی کے مقابلے نسبتاً آرام دہ بھی تھا۔ اس کی ایک وجہ برسات کی طغیانی کے بعد دریائے جمنا کے بہاؤ کا تیز ہو جانا بھی رہا ہوگا۔ کیونکہ اس طرح کم وقت میں زیادہ فاصلہ طے کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے سابقہ منصوبے میں دوسری تبدیلی یہ کی کہ وہ اب بنارس میں قیام نہیں کریں گے اور بنارس کا وقت الہ آباد میں گزاریں گے۔ جیسا کہ یہاں سے باندہ کے محمد علی خاں کے نام لکھے گئے ان کے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی کم از کم یہاں پہنچنے تک غالب کی نظر میں بہشت خرم وفردوس معمور، آئینۂ گنگ بدست محبوب خوش رنگ، عبادت خانہ ناقوسیاں وکعبہ ہندوستاں اور ممدوح ومحسود دہلی، بنارس کی تقدیس، اہمیت اور وقعت کم اور شہر ملعون، صحن جہنم، بھوتوں کی ویران بستی، محبت وحیا سے عاری پیر وجواں کا خطہ، اور وادی ہولناک الہ آباد میں وقت گزارنے کی خواہش زیادہ تھی۔ غالب بنارس کیوں آنا چاہتے تھے؟ اور بعد میں انہوں نے اپنا یہ ارادہ کیوں بدل دیا؟ ارادے کے باوجود وہ الہ آباد میں کیوں نہ رکے اور دوبارہ بنارس آنے اور یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ یہ سب باتیں ابھی تشنہ تحقیق ہیں۔ لیکن یہی باتیں ہیں جن کا

تجزیہ کر کے ہم غالب کی نفسیات کو سمجھ سکتے ہیں۔

بہتر ہوگا کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم مرزا غالب کے اس فارسی خط کے اردو ترجمہ کے کچھ ضروری اقتباسات کا مطالعہ کرتے چلیں جو انہوں نے باندہ کے اپنے رفیق محمد علی خاں کو الہ آباد اور بنارس کے بارے میں لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:

'الہ آباد بھی کیا واہیات جگہ ہے۔ خدا اس ویران جگہ پر لعنت کرے کہ اس میں نہ کسی بیمار کے لائق دوا ہے اور نہ کسی مہذب انسان کے لائق کوئی شے ملتی ہے۔ اس میں نہ مرد و زن کا وجود ہے اور نہ اس کے پیر و جوان کے دل میں محبت و مروت ہے۔ اس کی آبادی دنیا کے لیے روسیاہی کا باعث ہے۔ اس کی ویران بستی قابل کاشت زمین ہے...... اس ہولناک وادی کو شہر کہنا کتنی ناانصافی ہے اور کتنی بے حیائی ہے کہ انسان اس بھوتوں کی بستی میں رہے۔ صحن جہنم...... چونکہ اس شہر نے یہ سن لیا ہے کہ نیکوں کے صدقے میں بدوں کو بھی بخش دیں گے اس لیے اپنے تئیں ہزاروں امیدوں کے ساتھ بلکہ بصد ہزار خواری بنارس کے پہلو میں ڈال دیا ہے اور دریائے گنگا کو شفاعت کے لیے اس کی طرف روانہ کر دیا ہے۔

ہر چند کہ بنارس کی نازک طبیعت پر اس شہر روسیاہ کی طرف دیکھنا گراں ہے مگر اس اعتماد پر اس کا دل قوی ہے کہ گنگا کا واسطہ درمیان میں ہے۔ بخدا اگر کلکتہ سے واپسی الہ آباد کے راستے ہوئی تو میں وطن آنے کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا اور کبھی واپس نہ ہوؤں گا۔ بالجملہ ایک رات اور دن اس دیوؤں (بھوتوں) کی بستی میں ذریعہ بار برداری کے فقدان کے جرم میں قید رہ کر جب دوسرے روز ایک گاڑی مل گئی، صبح کے وقت گنگا کنارے پہنچ کر بہت جلد ہوا کی طرح دریا پار کر لیا اور پائے شوق سے

بنارس کی طرف چل دیا۔'

'بنارس میں ورود کے روز باد جاں فزا اور بہشت آسا نسیم مشرق کی طرف سے چلی جس نے میری جاں کو توانائی بخشی اور دل میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ اس ہوا کے اعجاز نے میرے غبار کو فتح کے جھنڈوں کی طرح بلند کر دیا اور اس نسیم کی لہروں نے میرے جسم میں ضعف کا اثر نہ چھوڑا۔

کیا کہنے ہیں شہر بنارس کے۔ اگر میں اس کو فرط دل نشینی کی وجہ سے قلب عالم کا سویدائے قلب کہوں تو بجا ہے۔ کیا کہنے ہیں اس آبادی کے اطراف کے۔ اگر جوش سبز و گل کی وجہ سے میں اسے بہشت روے زمین کہوں تو بجا ہے۔ اس کی ہوا مردوں کے بدن میں روح پھونک دیتی ہے۔ اس کی خاک کے ہر ذرے کا یہ منصب ہے کہ مقناطیس کی طرح راہ رو کے پاؤں سے پیکان خار کو کھینچ لے۔ اگر دریائے گنگا اس کے قدموں پر اپنی پیشانی نہ ملتا تو وہ ہماری نظر میں اس قدر معزز نہ ہوتا۔ اور اگر خورشید اس کے در و دیوار کے اوپر سے نہ گذرتا تو وہ اس طرح روشن اور تابناک نہ ہوتا۔ دریائے گنگا بہ حالت روانی گویا کہ بحر طوفاں خروش ہے۔ دریائے گنگا کا کنارا ملاء اعلیٰ کے ساکنین کا گھر ہے۔ سبزہ رنگ پری چہرہ حسینوں کی جلوہ گاہ کے مقابلے میں (یا اس کا عکس پڑ کر) قدسیان ماہتابی کے گھر کتان کے ہو گئے ہیں (یہ شاعرانہ مفروضہ ہے کہ کتان کا لباس چاند کی روشنی میں پھٹ جاتا ہے)۔ اگر میں اس شہر کی کثرت عمارات کا ذکر کروں تو وہ سراسر مستوں کے ٹھکانے ہیں اور اگر میں اس کے اطراف کے سبزہ و گل کا ذکر کروں تو وہ گویا سراسر بہارستان ہے۔'

'اب ایک بہت بڑا مسئلہ میرے پیش نظر ہے اور اس بارے میں اگر دل شماتت اعدا سے زخمی نہ ہوتا تو بے خوف دین کو ترک کر دیتا۔ تسبیح کو توڑ دیتا، تلک لگا لیتا۔ جنیو پہن لیتا اور اس وضع سے اتنے عرصے گنگا کے کنارے بیٹھا رہتا کہ اپنے آپ سے آلائش ہستی کی گرد دھو ڈالتا اور قطرے کی طرح دریا میں گم ہو جاتا۔ اس ارم آباد میں قدم رکھتے ہی کوئی علاج کیے یا کوئی دوا پیے بغیر ہی نئے عوارض کی تکلیف رفع ہو گئی ہے بلکہ میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اصل مرض کا کچھ حصہ بھی کم ہو گیا ہے۔ مرکبات معمول میں سے جتنی بھی میں فراہم کر پاتا ہوں اس کا سبب مستقبل میں مرض سے تحفظ سے بطور حزم واحتیاط ہے ورنہ اب نہ تو تلافی ماضی منظور ہے اور نہ رعایت حال۔'

'ہر چند کہ مجھے اس امر پر سخت اصرار ہے کہ آپ جلد از جلد جواب دیں، لیکن دل گم نامی اور ہیچ کسی کی شرم سے ہزار چھریوں سے زخمی ہے، کیونکہ میں جس مکان میں مقیم ہوں وہ ایک ضعیفہ کا ہے جو روغن چراغ سے بھی محتاج ہے۔ اس کے گھر میں جو کا دانہ تک نہیں ہے۔ اس گاؤں کی طرح ویران ہے جس کے ساکنین خراج کے خوف سے گھر چھوڑ بھاگے۔ نہ تو اس کے پہلو میں بازار نام کی کوئی چیز ہے اور نہ اس کے قریب کوئی شاندار محل۔ لہٰذا خط کے پتے پر کیا لکھا جائے اور خود پیک خیال ہی نامہ بر ہو تو وہ تلاش میں آخر کس دروازہ پر جائے گا؟ میرے مخدوم! مکتوب کو اس کے مکتوب الیہ کے ساتھ خدا کے سپرد کر کے لفافہ پر پتہ لکھ دیجیے۔ محلہ نورنگ آباد، عقب سرائے نورنگ آباد، قریب حویلی گوسی خانساماں، درحویلی مٹھالی و میاں رمضان، اسد اللہ غریب الوطنی تازہ وارد کو ملے۔'

(تمام اقتباسات 'مکتوبات غالب، نامہ ہائے فارسی غالب
مرتبہ سید اکبر علی ترمذی مترجمہ لطیف الزماں، صفحہ ۷۵ تا ۸۳ سے
ماخوذ)

غالب کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے مندرجہ بالا حالات اور ان کے فارسی مکتوب کے درج بالا اقتباسات کے ساتھ ان کے دل میں ہونے والی کشمکش کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔خود ان کے بقول وہ اس وقت بیس ہزار روپے کے مقروض تھے اور دہلی میں قرض خواہوں کو منھ دکھانے کے لائق نہیں رہ گئے تھے یا کم از کم وہ ایسا سمجھ رہے تھے۔گھر کے حالات بھی دگرگوں تھے۔ان کے بھائی مرزا یوسف کے جنون اور علاج کا معاملہ ساتھ ساتھ چل ہی رہا تھا اور ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ان سب کو چھوڑ کر کلکتہ کے سفر کا ارادہ کرنے کا عمل ان کے لیے سفر کی صعوبتوں سے کم اذیت ناک نہیں تھا۔انہوں نے یہ سفر کیا تو یہ بات خود بہ خود واضح ہو جاتی ہے کہ وہ پیسوں کی قلت کس شدت سے محسوس کر رہے تھے۔بنارس آنے کے بعد اس طرف سے تو ان کو بے فکری تھی کہ یہاں ان کا کوئی ایسا شناسا نہیں تھا جسے دیکھ کر انہیں شرمندہ ہونا پڑتا۔پھر قیام بنارس کے دوران ان کا کسی قابل ذکر شخص سے ملاقات نہ کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر وہ یہاں کسی سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔اورنگ آباد سرائے جیسی نامانوس جگہ پر خاموش قیام اسے مزید پراسرار بنا دیتا ہے۔ان حالات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے اس وقت کے بنارس پر ایک نظر ڈال لیں تو کم از کم یہ اندازہ ہو کہ کیا اس وقت کچھ ایسے لوگ اس شہر میں تھے جن سے غالب کو ملنا چاہیے تھا؟

انیسویں صدی کا آغاز بنارس کے لیے اچھا ثابت ہوا تھا۔پہلی دہائی میں ہی یہاں دو بڑے ہندو مسلم فسادات ہو چکے تھے،جن میں لاتعداد لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور متعدد عمارات نذر آتش یا مسمار کر دی گئیں۔پہلا فساد اس وقت ہوا جب محرم کے جلوس کے دوران لاٹ کی عیدگاہ کو امام باڑے کے طور پر استعمال کیے جانے سے روکنے پر وہاں ایستادہ ستون کو مسلمانوں نے ہٹانے کی کوشش کی۔پتھر کا یہ ستون (لاٹ بھیرو) ہندوؤں میں بڑا مقدس سمجھا جاتا تھا۔مسلمانوں کی اس کوشش سے ہندو بگڑ گئے اور اس کے

نتیجے میں سارے شہر میں مسلمانوں کی اجتماعی مارکاٹ کا سلسلہ شروع ہوا جو اس وقت کے مجسٹریٹ ڈبلیو ڈبلیو برڈ کی کوشش کے باوجود کافی دنوں تک جاری رہا۔(varanasi Down the Ages۔مصنفہ کبیر ناتھ سُگل)چند سال بعد ۱۸۰۹ء میں دوسرا اور پہلے سے کچھ زیادہ تباہ کن فساد ہوا۔اس کا سبب یہ تھا کہ کچھ راجپوت ہندوؤں نے وشوناتھ مندر کے سامنے،گیان واپی مسجد کی قبلہ رخ دیوار سے ملحق ایک نئے مندر کی تعمیر شروع کر دی تھی جسے مسلمانوں نے گرادیا۔دوسرے دن یہاں پر ہندوؤں کی بھیڑ جمع ہوئی۔ جسے اس وقت کے مجسٹریٹ نے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔اسی دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ مسلمانوں نے لاٹ کا ستون گرا دیا اور اس مقدس مقام پر ایک گائے کی قربانی دی ہے۔اس خبر سے گائے گھاٹ پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان شدید جھڑپ ہوئی جس میں ۸۰ مسلمان مارے گئے۔یہ تو محض شروعات تھی بعد میں یہ فساد دونوں طرف کے سینکڑوں لوگوں کی جان لے گرتلا۔(کاشی کا اتہاس: مصنفہ ڈاکٹر موتی چندر)۔اس فساد کے بعد ۱۸۵۲ء تک یہاں کسی قسم کا تناؤ نہیں رہا۔یعنی غالب کے یہاں آنے کے وقت بنارس کے حالات معمول پر تھے اور یہاں چاروں طرف امن وامان تھا۔

بنارس میں رونما ہونے والے ان ناگوار واقعات کے اسباب دراصل اٹھارہویں صدی کے اواخر میں پوشیدہ تھے۔وارن ہیسٹنگز کے دوسرے حملے میں مہاراجا چیت سنگھ کی شکست اور فرار کے بعد انگریز سازش کے تحت شعوری طور پر یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق پیدا کرنا چاہتے تھے۔اس کے لیے انہوں نے مذہب جیسے نازک ہتھیار کا استعمال کیا۔یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ شاہ عالم کے بیٹے جواں بخت جہاندار شاہ نے بنارس کو اپنا مستقل مسکن بنالیا تھا۔اول اول انہیں انگریز حاکم کچھ احترام دے رہے تھے لیکن بعد میں لارڈ کارن والس نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی پرانی شان وشوکت بھول جائیں اور انہیں پنشن کی مد میں جو ۲۵۰۰۰ روپے ماہانہ مل رہے ہیں اسی میں اپنی گزر بسر کریں۔وہ ان کے بنارس میں رہنے سے بھی خوش نہیں تھا۔لیکن جلد ہی جہاندار شاہ کی موت ہوگئی۔ان کی موت کے بعد ان کی اولادوں کی پنشن میں مزید تخفیف کرتے ہوئے اسے ۲۵۰۰۰ ماہانہ سے ۱۸۰۰۰ کر دیا گیا۔اس میں سے ان کی

بیگم قتلک سلطان کو ۱۱۰۰۰ روپے ماہانہ، جس میں مرزا خرم بیگ اور مرزا مظفر بیگ کی پرورش کی رقم بھی شامل تھی، بڑے بیٹے مرزا شگفتہ بیگ کو ۴۰۰۰ روپے ماہانہ اور بیٹی جہان آبادی بیگم کو ۲۰۰۰ روپے ماہانہ طے ہوئے۔ ان تفصیلات سے محض یہ بتانا مقصود ہے کہ غالب کی بنارس آمد کے وقت جہاندار شاہ کے افراد خاندان مرزا شگفتہ بیگ اور مرزا خرم بیگ وغیرہ یہاں موجود تھے۔ جو اگرچہ انگریزوں کے معمولی پنشن خوار اور مالی اعتبار سے کمزور ہو چکے تھے لیکن جن میں اب بھی لارڈ کارن والس جیسوں کو خلعت سے نوازنے کا جذبہ موجود تھا۔ یہ مغل شہزادگان تخت دہلی اب بھی شہر کے معززین میں شمار کیے جاتے تھے اور غالب کو ان سے ملاقات کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونا چاہیے تھی۔

اس وقت بنارس کی دنیائے قرطاس وقلم بھی خاصی آباد تھی۔ یہاں فارسی واردو ادبیات کے مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے ایک سے ایک اعلٰی مرتبہ لوگ موجود تھے۔ ممکن ہے غالب اس دوران یہاں کے کچھ سنسکرت علما سے ملے ہوں۔ کیونکہ ان سے ایک عام انسان، ایک عام طالب علم کی حیثیت سے ملنے میں ان کے قیام کے راز کے طشت از بام ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن چونکہ اس کی کوئی شہادت نہ تو غالب کے خطوط سے ملتی ہے اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے۔ اس لیے اس شعبے کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ فارسی علم وادب کی دنیا میں یہاں اس وقت سب سے بڑا نام مفتی محمد ابراہیم بنارسی کا ہے جو ملا محمد عمر سابق بنارسی کے صاحبزادے تھے۔ یہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ علم ہیئت وہندسہ کے زبردست ماہر تھے۔ پیشے کے اعتبار سے پہلے لارڈ لیک کے میر منشی رہے اور بعد میں عدالت عالیہ کے منصب افتا پر فائز ہوئے۔ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کے جذبے کے تحت یہ درس وتدریس کا کام بھی کرتے رہے۔ ان کے والد ملا سابق بنارسی شیخ علی حزین کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اور علم وادب کے میدان میں مختلف زاویوں سے اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ محمد ابراہیم کے صاحبزادے مفتی محمد اسمٰعیل المتخلص بہ ثابت بنارسی بھی اس وقت سرگرم عمل تھے۔ جو اپنے والد کے سبکدوش ہونے کے بعد عدالت عالیہ میں منصب افتا پر فائز رہے۔ آگے چل کر سرسید احمد خاں سے بھی ان کے اچھے دوستانہ مراسم استوار ہوئے۔ وہ شاعر تھے اور اپنے کلام پر مصحفی سے

اصلاح لیتے تھے۔ان کے علاوہ اکرم علی واسطی اور مولانا عنایت علی جیسے لوگ بھی اس وقت بنارس میں موجود تھے جو غالب کی قدر افزائی کر سکتے تھے۔لیکن وہ ملے کسی سے نہیں۔ظاہر ہے غالب نے شاید یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ بنارس میں کسی سے نہیں ملیں گے۔

اپنے کچھ خطوط اور مثنوی چراغ دیر میں غالب نے بنارس کی تعریف کے ساتھ ساتھ یہاں دلکش عمارتوں کی کثرت،سبزہ زار اور قدرتی حسن کا بھی ذکر کیا ہے۔غالب جب یہاں آئے تھے تو یہ شہر واقعتاً خوبصورت باغات اور گھنے جنگلات کا شہر تھا۔شہر میں جگہ جگہ متعدد خوبصورت کنڈ موجود تھے۔بیشتر کوٹھیوں سے ملحق باغات تھے۔جن کے گھروں میں یہ سہولت میسر نہ تھی انہوں نے شہر کے باہر اپنے باغات بنا رکھے تھے،جہاں فرصت کے اوقات جا کر رہائش اختیار کرتے تھے۔مقامی اصطلاح میں اس عمل کو'بہری النگ' کہا جاتا ہے۔سارا شہر ہرے بھرے درختوں سے پر تھا۔یہ تمام باتیں ہمیں ان پینٹنگس کو دیکھنے سے معلوم ہوتی ہیں جو مصور بنارس جیمس پرنسپ(james prinsep) نے بنائی تھیں۔واضح رہے کہ پرنسپ کا بنارس میں رہائش کا زمانہ وہی ہے جو غالب کے بنارس میں ورود کا زمانہ ہے۔اس زمانے میں بنارس کا ایک رائج نام'آنند کانن' بھی تھا یعنی گلشن مسرت یا بقول غالب بہشت خرم۔آنند محض خوشی کا متبادل نہیں ہے بلکہ روحانیت کی ایک اصطلاح بھی ہے۔معبود برحق کے لیے سچد انند(ست،چت اور آنند) کا نام اسی مفہوم میں رائج ہے۔مختلف معاصر انگریز مورخین نے اسے بجا طور پر کہیں،فارسٹ پیراڈائز آف گارڈنز'(forest paradise) کہیں'فارسٹ آف بلس(forest of Bliss)' اور کہیں 'پیراڈائز آف گارڈنز'(paradise of gardens) کے نام سے یاد کیا ہے۔اُس زمانے میں آج کا لہرابیر (Lahurabir) اور درگا کنڈ (Durga Kund) جنگلات تھے۔ رکا محال،چوکھمبا اور ٹھٹھیری بازار کے بارے میں تو اب بھی بیشتر لوگ جانتے ہیں کہ یہ جنگلوں کو کاٹ کر بسائے گئے محلے ہیں۔ان کے لیے اب بھی'بن کٹی' کی اصطلاح سننے میں آجاتی ہے۔موجودہ'گودولیا'(Godowlia) اور'لکسا'(Laxa) اس عہد میں رئیسوں کے اسطبلوں کے لیے مخصوص تھا۔جب وہ گنگا کے دشاشومیدہ گھاٹ پر آتے تھے تو یہاں ان کے گھوڑے باندھے جاتے تھے۔سارے بنارس میں چاروں طرف روحانیت کا دور دورہ

تھا۔ دریائے گنگا کے کنارے دور دراز سے آئے ہوئے تارک الدنیا سنیاسی دھونی رمائے دکھائی دیتے تھے۔ گھاٹوں پر صفائی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں لوگ دریا کنارے بیٹھ کر لوگوں کو غسل کرتے، ورزش کرتے، سوریہ نمسکار کرتے، گنگا پوجا کرتے، طلوع وغروب آفتاب کا نظارہ کرتے، بجروں، ناؤں کو دریا میں آتے جاتے، رقص وسرود کی ثقافتی محافل آراستہ کرتے دیکھا کرتے تھے۔ غالب نے یہی بنارس دیکھا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ ایسا بنارس دیکھ کر غالب کا روحانیت پسند دل مبہوت ہوگیا ہو اور یہاں حاصل ہونے والے 'آنند' میں وہ کسی کو مخل ہونے دینا نہ چاہتا ہو۔ اسی لیے اس نے یہاں گوشہ نشینی اختیار کر لی ہو، کہ لوگ تو آئندہ بھی ملتے رہیں گے لیکن روحانیت، کا یہ مرکز پھر کہاں ملے گا۔

یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۱۸۰۱ء میں بنارس کے کلکٹر مسٹر ڈین نے شہر کوتوال ذوالفقار علی خاں کے ذریعے بنارس کی مردم شماری کروائی تھی۔ اس کے رو سے اس وقت بنارس میں کل انتیس ہزار نو سو پینتیس (۲۹،۹۳۵) مکانات تھے، جن میں بارہ ہزار ایک سو پچپن (۱۲،۱۵۵) پختہ تھے اور سترہ ہزار سات سو اسی (۱۷،۷۸۰) کھپریل والے۔ ان میں پختہ مکانوں کو مزید تفصیل اس طرح درج ہے۔ پہلے درجے کے ایک منزلہ مکان پانچ سو (۵۰۰)، دوسرے درجے کے دو تلے مکان پانچ ہزار پانچ سو (۵،۵۰۰) تیسرے درجے کے سہ تلے مکان تین ہزار چھ سو (۳،۶۰۰)، چوتھے درجے کے چو تلے مکان ایک ہزار پانچ سو (۱،۵۰۰)، پانچویں درجے کے پانچ تلے مکان سات سو پچپن (۷۵۵) اور چھٹے درجے کے چھ تلے مکان تین سو (۳۰۰) تھے۔ کچے اور کھپریل والے مکانوں کی مزید تفصیل اس طرح ہے۔ پہلے درجے کے ایک تلے مکان دس ہزار دوسو (۱۰،۲۰۰)، دوسرے درجے کے دو تلے مکان چھ ہزار چھہتر (۶،۰۷۶)، کچی مڑیاں ایک ہزار تین سو پچیس، باغیچے کے ساتھ مکان اٹھتر (۷۸)، صرف کھپریل والے ایک سو ایک (۱۰۱)۔ اس وقت یہاں کی آبادی کل پانچ لاکھ چھ سو پچیس (۵،۸۲،۶۲۵) نفوس پر مشتمل تھی۔ اس مردم شماری میں شرفا، روسا، مختلف دیسی ریاستوں کے نو وارد شہزادگان، ہتھیار بند سپاہیوں، مہاجنوں، تاجروں، چوبداروں، خدمتگاروں، مانجھیوں، حکیموں، ویدوں، کہاروں،

دھوبیوں، نائیوں، رنڈیوں، طالب علموں، فقیروں وغیرہ کی بھی الگ الگ گنتی کی گئی تھی۔ اور ان سب میں ہندؤں اور مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی بنیاد پر ہر ایک کی الگ الگ تعداد درج کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جعل سازوں (۴۰) جھوٹی گواہی دینے والوں (۴۰۰) چوری کا سامان خریدنے والوں (۵۰) صرف چوری کرنے والوں (۲۰۰) جواریوں (۴۰) عدالت سے چوری کے جرم میں سزا پانے والوں (۱۰۰) اور غنڈوں (۲۰۰) کی بھی مردم شماری کی گئی تھی۔ اس مردم شماری میں دوسرے امراء و روٴسا کے علاوہ مرزا جواں بخت جہاندار کی اولاد میں مرزا خرم بیگ اور ان کے افراد خاندان اور ملازمین کی تعداد ایک ہزار، مرزا شگفتہ بیگ اور ان کے افراد خاندان معہ ملازمان تین سو بتائی گئی ہے۔
اس مردم شماری کی نوعیت نہ تو سرکاری تھی اور نہ ہی اس کے ذریعہ فراہم کردہ اعداد وشمار پر مورخین اعتبار کرتے ہیں۔ اس کا سبب غالبًا یہ ہے کہ یہ کام فرمان کے جاری ہونے کے بعد اتنے کم وقت میں تکمیل کو پہنچا کہ اس بات پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس میں ذہین کوتوال ذوالفقار علی خان کا اندازہ زیادہ کام کر رہا ہے، حقیقی مردم شماری کا عمل کم۔ اس میں مردم شماری کے مروجہ اصول وضوابط کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ البتہ آگے چل کر عظیم مصور ومورخ جیمس پرنسپ نے، جو بنارس کی تاریخ نویسی کے عمل میں غالبًا سب سے اہم شخصیت ہے ۲۹۔۱۸۲۸ء میں جو مردم شماری کرائی گئی تھی اسے مورخین کی اکثریت اعتبار کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اور یہ غالب کے قیام بنارس کے عہد سے بالکل قریب کا زمانہ بھی ہے۔ پرنسپ کے مطابق اس وقت بنارس کی آبادی ایک لاکھ اکیاسی ہزار چار سو بیاسی (۱،۸۱،۴۸۲) تھی، جس میں مسلمانوں کی تعداد اکتیس ہزار دو سو اڑتالیس (۳۱،۲۴۸)، برہمن بتیس ہزار تین سو اکیاسی (۳۲،۳۸۱)، راجپوت، بھومیہار اور کھتری ملا کر چودہ ہزار چورانوے (۱۴،۰۹۴)، بنیے آٹھ ہزار تین سو (۸،۳۰۰) اور شودر ساٹھ ہزار تین سو دو (۶۰،۳۰۲) تھے۔ اس مردم شماری میں بچوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ (بہ حوالہ کاشی کا اتہاس مصنفہ ڈاکٹر موتی چندر)
مثنوی چراغ دیر پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے یہ جان لینا مفید ہوگا کہ اس مثنوی کی تخلیق کے دوران غالب کے جذبات کیا رہے ہوں گے۔ عام طور پر شاعر کسی موضوع کا

انتخاب کرنے کے بعد اس میں خالصتاً شاعرانہ انداز میں حسن و جمال کی تلاش کرتا ہے اور پھر اپنی مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے جمالیات کے جملہ لوازم کو برتتے ہوئے شعر کہتا ہے۔ اس ضمن میں وہ تمام اشعار بھی آجاتے ہیں جو کسی کی فرمائش پر یا کسی کو کسی خاص مقصد کے لیے خوش کرنے کے لیے کہے جاتے ہیں۔ ایسے اشعار میں شاعر کی مشاقی اور استادانہ کمال کے وافر ثبوت تو مل جاتے ہیں لیکن اس کے دل کی ترجمانی یا حقیقت حال کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر کسی شے کے جمال سے متاثر ہو جائے اور اپنے کو شعر کہنے پر مجبور پائے۔ ایسی شاعری کی مثالیں بھی ہمارے شعری ذخائر میں وافر تعداد میں موجود ہیں۔ اول الذکر شاعری لفاظی ہوتی ہے۔ اور آخر الذکر دلی جذبات و کیفیات کی ترجمان۔ دونوں کی تاثر پذیری میں بھی فرق ہوتا ہے۔ عام طور پر جب شاعر کسی شخص یا جگہ کی تعریف کرتا ہے تو اس کی کچھ غرض ہوتی ہے۔ یا تو اسے اس شخص یا جگہ سے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے، یا وہ کسی مصلحت کی بنا پر اس شخص یا اس جگہ کے لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے اور غالب کی اس وقت کی داخلی کیفیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تخلیق کے پس پشت ان دونوں میں سے کوئی سبب نہیں ہے۔ یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس مثنوی کا خالق شہر بنارس کے حسن اور یہاں سے باشندوں کے سلوک سے بے حد متاثر ہوا ہے۔

اس مثنوی میں کل ایک سو آٹھ شعر ہیں۔ یہ عدد ہندوؤں یا باشندگان بنارس کی اکثریت کے عقاید کی رو سے بے حد مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی روحانی دولت 'آٹھ سدھیوں، نوندھیوں اور متعدد ردھیوں، کی کل جمع بھی ایک سو آٹھ ہوتی ہے۔ عموماً کسی مقدس شخصیت کے نام کے پہلے بھی شری شری ایک سو آٹھ کا سابقہ لگا دیا جاتا ہے۔ یہاں شری کا مفہوم اس شخص کے تقدس کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ تاثر دینا بھی ہے کہ اس پر خدا کی بے پناہ رحمتوں کا نزول ہوا ہے۔ غالب نے شعوری طور پر اس مثنوی میں اشعار تعداد ایک سو آٹھ رکھ کر اس شہر کے تقدس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ غالب بھلے ہی بنارس میں اردو اور فارسی کے اکابرین سے نہ ملے ہوں لیکن ایک اجنبی کی حیثیت سے ہی سہی یہاں کے ہندو علما سے ضرور ملے تھے اور ان سے ہندو مذہب کا کچھ درس بھی لیا تھا۔ اس مذہب سے ان کا تعلق

محض دلچسپی تک محدود نظر نہیں آتا بلکہ اگر محمد علی خاں کو مرسلہ ان کے خط کی بات کو مبالغہ نہ مانیں تو وہ بنارس اور یہاں کے عقاید سے اس حد تک متاثر ہو گئے تھے کہ اگر کلکتہ کا سفر در پیش نہ ہوتا تو وہ اپنا مذہب ترک کر کے مستقلاً یہاں رہنے پر بھی آمادہ تھے۔ غالب کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی حیرت کی بات بھی نہیں ہے۔ وہ مذہبی مساوات، صلح کل اور رواداری کے مبلغ اور انسانیت کے قدر دان تھے۔ انہیں جہاں بھی انسانیت کے قدر شناس نظر آجاتے تھے وہ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ بنارس میں شاید کچھ ایسا ہی ہوا تھا جس نے ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ غالب نے کبھی کسی دوسرے شہر کے بارے ایسے جذباتی لگاو اور اس طرح کے والہانہ خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ دہلی جیسے شہر کے بارے میں بھی نہیں، جو بہ وجوہ غالب کو پسند تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بنارس نے غالب کے دل ودماغ پر کتنے گہرے اثرات مرتب کیے ہوں گے۔ اور اس کے نتیجے میں غالب کا یہ شاہکار 'مثنوی چراغ دیر' وجود میں آیا ہوگا۔

یہ مثنوی شدت آلام میں دل کے اندر برپا آتش فشاں کے پھوٹ پڑنے اور اس میں پوشیدہ اسرار کے طشت از بام کردینے پر آمادگی کے ذکر سے شروع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے غالب جس امید وبیم کی حالت میں دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تھے اس نے تذبذب کی ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ ناکامی کا خوف اور کامیابی کی مبہم سی امید میں باہم ٹکراو ہو رہا تھا۔ دہلی میں قرض خواہوں نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا اور اب یہی واحد امید رہ گئی تھی کہ کلکتہ میں ان کی دادخواہی کسی مثبت نتیجے تک پہنچے گی اور ان کے ساتھ ہوئی ناانصافی کا ازالہ ہو جائے گا۔ نتیجے میں ان کے سارے مسائل پلک جھپکتے حل ہو جائیں گے۔ اس مہم میں ناکامی کا تصور ہی غالب کے لیے سوہان روح رہا ہوگا۔ مثنوی کا پہلا شعر غالب کی اسی کیفیت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ تاثرات کا یہ سلسلہ پانچویں شعر تک گیا ہے جس میں غالب نے مختلف تشبیہات کا سہارا لیا ہے اور ہر شعر ان کی جدت پسندی اور تلاش ترکیب کا ثبوت ہے۔ پتھر کی رگوں سے چنگاریوں کا نکلنا، مٹھی بھر خاک سے غبار کا اٹھنا، شکایتوں کی زیادتی سے دل میں ابال، ایک حقیر بلبلے میں سمندری طوفان کی شدت۔ دل کا لبوں تک آنا، سانسوں کو خون میں ڈبو دینے والی فریاد کا نکلنا، کیونکہ اس میں جگر کی قاشیں ہیں، ذہنی

الجھنوں کو زلف سے زیادہ الجھی ہوئی داستان قرار دینا، ایک ایک بال کے زباں بن جانے کا ذکر کرنے جیسی تشبیہات ظاہر ہے غالب کے اندر برپا طوفان تلاطم خیز کا بخوبی اظہار کرتی ہیں۔ غالب کے ان اشعار سے ان کے دل کی ہلچل کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غالب مثنوی کے چھٹے سے انیسویں شعر تک دوستوں کی بے التفاتی کے شاکی ہیں یہ شکایات ان اخلاقی روایات کی پابند ہیں جو اس عہد کا طرہ امتیاز رہی ہیں۔ صاف جھلکتا ہے کہ غالب کچھ اور کہنا چاہتے ہیں لیکن ان کی شرافت نفس ہر ہر قدم پر ان کی دامن کش ہے۔ اسی مجبوری نے ان کے ان اشعار میں شعریت اور ان کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ دوستوں سے شکایت کرنے کو کتاں کو چاندنی میں دھونے کا عمل قرار دے کر خود اس کی بے معنویت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ کہنا کہ میں اپنے ہی ساز کے سوز میں جل کر کباب ہو گیا ہوں، اپنی فریاد کو ساز قرار دینا اور سانسوں کو اس کا تار بتانا اور کہنا کہ اس کی ہڈیوں میں بانسری کی طرح آنچ بھری ہے، دہلی کی شکایت کرتے ہوئے کہنا کہ اس سمندر نے مجھ جیسے موتی کو نکال کر پھینک دیا ہے اور اس آہن نے مجھے گرد کی طرح جھاڑ دیا ہے، تقدیر پر الزام کہ اس نے جب سے اسے دہلی سے نکالا ہے اس کا سرو سامان طوفان کے حوالے کر دیا ہے، دہلی کی اس وقت کی صورت حال اور خود غالب کی کیفیات کی جانب بڑا بلیغ اشارہ ہے۔ یہ کہنا کہ اب وہاں کوئی میرا ہمدرد نہیں رہا یا یہ کہ اب دنیا میں کہیں میرا وطن ہی نہیں ہے۔ پھر تین لوگوں، فضل حق خیر آبادی، حسام الدین حیدر خاں اور امین الدین احمد خاں کو نام بہ نام یاد کرنا جو انہیں عزیز تھے۔ ایسے وقت اپنے ان ہمدردوں کو اتنی شدت سے یاد کرنا اشارے کرتا ہے کہ غالب اس دوران ذہنی طور پر کتنی پریشانی محسوس کر رہے تھے۔ غالب کو شکایت ہے کہ مانا کہ میں دہلی سے چلا آیا لیکن یہ تینوں دوست مجھے کیسے بھول گئے۔ وہ کہتا ہے کہ وطن کی جدائی سے پریشان نہیں، دوستوں کی بے مروتی اور عدم التفات کا مارا ہوا ہوں۔ کیونکہ اگر دہلی نہیں ہے تو کوئی غم نہیں، دنیا سلامت جگہ کی کیا کمی ہے۔ چاہے جس باغ میں کسی درخت کی ٹہنی میں آشیانہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار توجہ طلب ہیں۔ جس شخص یا جگہ سے محبت میں شدت ہو اس سے امیدوں کی وابستگی بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور ان کے پورا نہ ہونے پر شاید ان لوگوں کو غیرت دلانے کے لیے شکایت کچھ زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس

بات کو وہ شخص زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے جو خود ان حالات سے گزر رہا ہو۔ شاید غالب جب بنارس کی تعریف میں رطب اللسان تھے، اس وقت اہل دہلی بالخصوص ان تین احباب کو غیرت دلانے کا یہ عمل بھی کارفرما رہا ہو۔

اس کے بعد شعر ۲۰ تا ۸۱ وہ باسٹھ اشعار ہیں جن میں غالب نے بنارس کی تعریف کی ہے۔ چونکہ مثنوی کا اصل موضوع یہی ہے اس لیے ان پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں:

'پھولوں کی اس سرزمین پر میرا دل آیا ہے۔ کیا اچھی آبادی ہے جہاں بہار کا چلن ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ مقام تفاخر میں دہلی اس کا طواف کرنے آتا ہے۔ اس مبارک اور عزیز بہار سے نگاہ کو ادائے گلشن کا دعویٰ ہے۔ کاشی کی تعریف میں خوش بیانی کی بدولت کلام کو یہ فخر ہوتا ہے کہ فردوس ساماں ہو گیا۔ سبحان اللہ، بنارس کو خدا نظر بد سے بچائے، یہ ایک مبارک جنت ہے، بھرا پرا فردوس ہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ بنارس حسن میں چین کے مثل ہے تو یہ تشبیہ بنارس کو ایسی ناگوار گزری کہ آج تک گنگا کی موج اس کے ماتھے کا بل بنی ہوئی ہے۔ اس کے وجود کا اندازہ ایسا خوش گوار ہے کہ دہلی ہمیشہ اس پر درود بھیجتا رہتا ہے۔ شاید دہلی نے بنارس کو خواب میں دیکھ لیا، تبھی تو دہلی کے منھ میں نہر (سعادت خاں) کا پانی بھر آیا ہے۔ دہلی کو حاسد کہنا بے ادبی ہے تاہم اگر بنارس پر رشک آتا ہو تعجب نہیں۔ آواگون کا عقیدہ رکھنے والے لب کھولتے ہیں تو اپنے مذہب کے مطابق کاشی کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ کہ جو شخص اس باغ پر ان چھوڑے اس کی آتما نروان حاصل کر لیتی ہے۔ پھر سے جسم مادیت سے میل نہیں کھاتی۔ اُس کی امید (نجات) کا سرمایہ چمن بن جاتا ہے کہ وہ مر کر زندہ جاوید ہو جائے گا۔ روح کو

راحت بخشنے والے اس مقام کے کیا کہنے جو روحوں سے نظر بد کا اثر بھی دھوڈالتا ہے۔

بنارس کی آب وہوا کو دیکھتے ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کی فضا میں صرف آتما رہے۔ اے شخص جو ناز کی کیفیت سے غافل ہے، ذرا بنارس کے پریزادوں پر نگاہ ڈال۔ اُن آتماؤں کو دیکھو جن پر تن کا خول نہیں ہے، وہ روپ ہے جسے پانی مٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ اُن کی فطرت ہلکی پھلکی ہے، پھول کی باس کی طرح یہ لوگ جان ہی جان ہیں، جسم حائل نہیں۔ اس شہر کا گھاس پھوس بھی گویا باغ ہے اور اس کا گردوغبار بھی روح کا لطیف غبار ہے۔ دنیا کے اس پرانے بت کدے میں جو ہمیشہ رنگ بدلتا رہتا ہے بنارس کی بہار رنگ کی تبدیلی سے محفوظ ہے۔ چاہے بہار کا موسم ہو، خزاں کا ہو یا گرمی کا، ہر موسم میں یہاں کی فضا جنت بنی رہتی ہے۔ سخت سردی اور سخت گرمی کے موسم میں دنیا بھر سے بہار اپنا سامان لپیٹ کر سردی وگرمی گزارنے بنارس آجاتی ہے۔ خزاں کا موسم جب یہاں ظہور کرتا ہے تو وہ بنارس کے لیے چندن کا ٹیکہ ہوتا ہے۔ اس چمن زار کی ہوا کے آگے سر جھکاتے ہوئے بہار موج گل کا جنیو باندھ لیتی ہے۔ اگر آسمان نے ماتھے پر اس کا تلک نہیں لگایا تو پھر یہ شفق کی لہروں کی رنگینی کیا ہے؟ اس شہر کی ہر مٹھی خاک مستی کی وجہ سے عبادت گاہ ہے اور اس کا ہر ایک کانٹا سبزی میں بہشت ہے۔ اس شہر کی آزادی بت پرستوں کی راجدھانی ہے، اور شروع سے آخر تک وہ مستوں کا تیرتھ ہے، سنکھ پھونکنے والوں کا عبادت خانہ، اور واقعی ہندوستان کا کعبہ ہے۔

اس کے حسینوں کا بدن جلوہ طور سے بنا ہے، سر سے پاؤں

تک خدا کا ہی نور ہے، اسے نظر نہ لگے۔ اُن کی کمریں نازک اور دل مضبوط، الھڑ پن ہوتے ہوئے بھی اپنے معاملے میں ہوشیار۔ چونکہ ان کے لبوں پر آپ سے آپ مسکراہٹ رہتی ہے، اس لیے ان کے منھ بہار کے پھولوں سے زیادہ پر بہار ہیں۔ ان کی ادا ایک پورے باغ کا جلوہ ہے اور ان کی چال میں سو قیامتوں کے فتنے جاگتے ہیں۔ لطافت میں وہ موج گوہر سے زیادہ نرم رفتار اور بانکپن میں وہ عاشق کے لہو سے زیادہ تیز رو۔ قد کی اٹھان سے چال کا وہ البیلا انداز ہے کہ گویا پھولوں کے تھالے میں جال بچھا ہو۔ اپنے رنگین جلووں سے وہ ہوش اڑا لے جائیں، بستر کے لیے بہار اور گود کے لیے نوروز ہیں۔ اپنے جلوے کی دمک سے شعلہ اٹھا دینے والی ایسی مورتیاں جو خود مورتی پوجا کریں لیکن برہمن کو جلائیں۔

دونوں دنیاؤں کے سروسامان کے ساتھ وہ باغ کی رنگینی ہیں، ایسی کہ ان کے چہروں کی روشنی سے گنگا کے کنارے چراغاں ہوتا ہے۔ اشنان کرنے کی وہ ادا کہ ہر ایک موج دریا کو آبرو کی نوید پہنچ جائے۔ اس کے قد وقامت کیا ہیں، قیامت ہیں، لمبی لمبی پلکیں، جن پلکوں سے دل کی صف پر برچھیاں لگیں۔ بدن ایسے کہ دل کو بڑھاوا ملے اور سر سے پاؤں تک دل کی راحت کی خوش خبری۔ اپنی مستی سے موج کو آرام عطا کرنے اور حسن ولطافت سے پانی کو جسم وجسمانیت دینے والی، یعنی ان کا عالم مستی دیکھ کر موج ساکن ہو جاتی ہے اور ان کی خوش بدنی سے پانی مجسم ہو جاتا ہے۔ پانی کے بدن میں ان کے اتر آنے سے آفت برپا ہو جائے اور سینے میں مچھلیوں کے سے سو دل تڑپیں۔ دریائے گنگا چونکہ اپنی تمنا کے اظہار کو بے تاب ہے اس

لیے موج کی صورت میں ایک نہیں کئی آغوشیں کھول دیتا ہے۔ حسینوں کے جلوے دیکھ کر موتی ایسے بے قرار ہوتے ہیں کہ سیپ کے اندر ہی پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ یوں کہو کہ بنارس اک دل ربا حسین ہے، جس کے ہاتھ میں صبح وشام سنگار کے لیے گنگا کا آئینہ رہتا ہے۔ اس پری چہرہ شہر کے چہرے کا عکس اتارنے کے لیے آسمان نے سورج کا آئینہ سونے سے بنایا ہے۔ نام خدا، کیا اس کا حسن و جمال ہے کہ آئینے میں اس کا عکس رقص کرتا ہے۔ یہ شہر حسن بے پروا کا بہارستان ہے، اور لاجواب ہونے میں ملکوں ملکوں اس کی کہانیاں مشہور ہیں۔ جب دریائے گنگا میں شہر نے اپنا عکس ڈالا تو بنارس آپ ہی بے نظیر ہو گیا۔ جب پانی کے آئینے میں اس کی صورت دکھا دی تو یہ شگون پورا ہو گیا کہ نظر بد لگنے کا اندیشہ نہیں رہا۔ چین کے ملک میں بنارس جیسا نگارستان نہیں ہوگا اور چین کیا ساری دنیا میں اس جیسی عمارتوں کا شہر نایاب ہے۔ اس کے لالہ زار جنگل جنگل بھرے ہیں اور اس کے بسنت چمن در چمن پھولتے ہیں'۔

'میں نے ایک رات کسی روشن ضمیر شخص سے جو زمانے کی گردشوں کا راز جانتا تھا، سوال کیا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، دنیا سے نیکی غائب ہو گئی، وفا، محبت اور دل جوئی کا پتہ نہیں۔ ایمان کا صرف نام ہی نام رہ گیا ہے، جعل وفریب کے سوا کام نہیں چلتا۔ باپ بیٹوں کے خون کے پیاسے ہیں اور بیٹے باپ کی جان کے دشمن۔ بھائی بھائی سے الجھا ہوا ہے۔ میل محبت ساری دنیا سے فرار ہوا جاتا ہے۔ قیامت کی ایسی کھلی نشانیاں موجود ہیں پھر قیامت کیوں نہیں آجاتی؟ صور پھونکنے میں اب کا ہے کی دیر ہے؟ قیامت کو راہ میں کون روکے ہوئے ہے؟ وہ کاشی

کی طرف اشارہ کر کے مسکرا دیا اور بولا ۔ یہ آبادی قیامت کو
روکے ہوئے ہے۔ صانع عالم کو درحقیقت یہ گوارا نہیں کہ ایسی
رنگین آبادی ویران ہوجائے۔ بنارس کا وقار اتنا بلند ہے کہ قوت
خیال اس کی چوٹی تک نہیں پہنچتی۔

(نثر میں یہ اردو ترجمہ ظ انصاری کا ہے)

درج بالا سطور میں غالب نے بنارس کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس کے لیے جیسی مخصوص اسلامی اصطلاحات کا استعمال روا رکھا ہے، یہ محض ان کی ہمت یا مذہب سے بغاوت کا ثبوت نہیں ہے بلکہ کئی اور زاویوں سے بھی توجہ طلب ہیں۔ ان پر غور کر کے یہ سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ ان دگرگوں حالات میں بھی غالب بنارس کے حسن سے کیوں اتنے مسحور ہیں۔ ان اشعار میں ہی ان اسباب کی طرح بھی اشارہ ملتا ہے، جو غالب کی بنارس میں پوشیدہ رہائش کا سبب بنے ہوں گے۔

شعر ۸۲ تا ۱۰۲، غالب نے بنارس کی خوش حالی کے مقابلے میں اپنی بدحالی کا ماتم کیا ہے کہ تم ایک ناکارہ انسان ہو جو اپنوں اور بے گانوں کی نظر سے گر چکے ہو۔ وہ اسے اپنی دیوانگی قرار دیتا ہے کہ وہ خود بھی دوستوں اور احباب کو بھول بیٹھا ہے۔ یہ امر خاص طور پر لائق توجہ ہے کہ بنارس کی تعریف کے فوراً بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے دہلی اور اہل دہلی کے ساتھ ناانصافی ہی نہیں، غداری کی ہے۔ وہ اسے اپنی دیوانگی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہارے خمیر سے یہ کس قیامت نے سر اٹھایا ہے۔ وہ اپنے اور اپنے دل پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے اپنے وطن عزیز کے مقابلے دوسرے شہر کی تعریف ضرورت سے زیادہ کر دی ہے۔ پھر کہتا ہے کہ بنارس کی ان رنگینیوں سے تمھیں کیا لینا دینا۔ تم تو غم کھاؤ اور اپنا خون پیو اور اسی میں اپنی جنت تلاش کرو۔ ظاہر ہے یہ ان کی مایوسی کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے۔ وہ پھول کی خوشبو کی طرح لباس ظاہری سے باہر آنا چاہتے ہیں جہاں جسم کی قید سے رہائی ملے اور آزادی نصیب ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ کاشی میں رہ پڑنا کم ہمتی اور کافرانہ حرکت ہے۔ انہیں، یہ بھی یاد آتا ہے کہ دہلی میں ان کے اہل خانہ ان کے آنے کے منتظر ہیں جن سے ان کے مستقبل کی خوشیاں وابستہ ہیں۔ یہ خیال آتے ہی

وہ اپنے پر لعنت ملامت کرنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسوس وطن میں لوگ مصیبت میں مبتلا ہیں اور تم آنکھوں کے لہو میں کشتی کھے رہے ہو یعنی فرضی باتوں کی جانب توجہ دے رہے ہو۔ تم سے متعلق لوگ اپنی دل کی خواہشوں کو مار کر بیٹھے ہیں اور تم نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ ان کی تمام پریشانیوں کا سبب تم ہو۔ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں اور حرف شکایت زبان تک نہیں لاتے۔ تم سے وہ بیزار سہی لیکن تمہارا بھرم وہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے دلوں کو زخمی کر کے تم پھولوں کے متمنی ہو یہ جائز نہیں ہے۔ پھر انہیں یاد آتا ہے کہ وہ عازم کلکتہ ہیں جہاں سب کچھ ابھی مبہم اور پریشان کن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان حالات میں تم کو دیوانہ ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنی دیوانگی کی یاد دلا کر اپنی کہی گئی باتوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد غالب اشعار ۱۰۳ تا ۱۰۸ ایک صوفی کی طرح 'فنا' کی بات کرنے لگتے ہیں۔ کہ اپنے جسم کو مصائب کے ہاتھوں میں سونپ دو اور مصائب پر اپنی جان نچھاور کر دو۔ اپنی ہوس کو فنا کے حوالے کر دو یعنی خواہشات سے دست بردار ہو جاؤ اور اگر یہ سب عقل کے ساتھ ممکن نہیں ہوتا تو دیوانگی قبول کر لو۔ جب تک دم میں دم ہے متحرک رہو، چلتے رہو اور لمحہ بھر کے لیے بھی تھک کر آرام کے لیے نہ رکو۔ چنگاری کی طرح فنا ہو جانے پر کمر بستہ رہو اور دامن جھاڑ کر آزاد ہو جاؤ۔ 'لا' یعنی نفی کو مان لو، تسلیم کر لو اور 'الا' یعنی اثبات کا نعرہ لگاؤ۔ اللہ اللہ کرو اور اس کے سوا جو کچھ ہے اسے پھونک دو۔ اور اس کے ساتھ ہی مثنوی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

اگر ہم بنارس کی تہذیب اور یہاں کی مذہبی اور اخلاقی صورت حال کے پس منظر میں غالب کی اس مثنوی کا مطالعہ کریں تو عقدہ کشائی کی کچھ سبیل بنتی ہے۔ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں آنے کے بعد غالب کا قیام طویل کیوں ہوا اور اپنے مزاج کے برخلاف غالب نے یہاں کسی سے ملاقات کی زحمت کیوں نہ کی۔ ہم جانتے ہیں کہ غالب کو دوستوں سے ملنا اچھا لگتا تھا، ان کی معیت سے انہیں مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ ان کی بے التفاتی، بے مروتی اور ان کا فراق ان کے لیے سوہان روح بن جاتا تھا۔ پھر بنارس میں ایسا کیا ہوا کہ ایسا دوست دار انسان ان تمام لوگوں سے دور رہا جن سے ملاقات کر کے اسے خوشی ہو سکتی

تھی۔ اگر ہم مثنوی کے اس حصے پر توجہ دیں جہاں غالب نے بنارس کی روحانیت اور اس کی تقدیس کا بیان کیا ہے تو یہ چیز بہ خوبی واضح ہوتی ہے کہ غالب جو بھی کہہ رہے ہیں وہ رسمی نہیں ہے۔ وہ واقعی بنارس کی روحانیت سے متاثر ہوئے تھے۔ وہی بنارس جس کے بارے میں پرانوں میں درج ہے کہ یہاں شب باشی یوگ ہے، شہر میں چہل قدمی کرنا یگیہ ہے، جو مل جائے اسی پر قانع ہو کر خوش رہنا دیوتاؤں کو دیا گیا تحفہ ہے اور کھیل کھیل میں کچھ کرنا دان دینا ہے اور روزمرہ کی گفتگو ایشور کا نام لینا ہے اور بستر پر دراز ہو جانا خدا کے لیے روانہ ہو جانا ہے لیکن کرائے کا مکان لے کر ایک ماہ تک یہاں رکے رہنا اسی علم کا نتیجہ تھا، جو یقیناً یہاں کے کسی عالم کے ذریعے اسے حاصل ہوا تھا۔ بنارس کی اس عظمت کا احساس انہیں بنارس آنے کے پہلے نہیں تھا۔ یہ یقیناً اس پہلے ہفتے کا کرشمہ تھا جو غالب نے سرائے میں رہ کر تفریح میں گزارا تھا۔

دراصل بنارس کے تناظر میں ہمیں غالب کو ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے نہیں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے جو تصوف اور روحانیت کا دلدادہ ہو۔ جو ہم جانتے ہیں کہ غالب تھے۔ تو ہمیں یہ بہ آسانی دکھائی دینے لگے گا کہ معاشی تنگی میں مبتلا، پریشان حال غالب جب بنارس آتا ہے تو اسے یہاں کی روحانی فضا میں اپنا درد واقعی کچھ کم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ 'چنا، چبینا، گنگ جل، کے شیدائی بنارس اور 'رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن' والے غالب کے اندر قناعت پسندی کی ایک قدر مشترک تو تھی ہی۔ جب وہ تسبیح توڑ کر زنار اور قشقہ لگا کر گنگا کے کنارے بیٹھنے کی بات کرتے ہیں تو یہ بات رسمی نہیں، حقیقی ہے۔ وہ واقعی ایسا ہی چاہتے تھے۔ جب وہ دریائے گنگا میں غسل کرتے حسین معشوقوں کو بدن سے عاری روح کی شکل میں دیکھتے ہیں تو غالب کی روحانیت پسندی میں شبہ نہیں رہ جاتا۔ دراصل ماضی کا بنارس آج کی طرح پتھروں اور اینٹوں کا جنگل نہیں تھا بلکہ سچ مچ یہ گھنے جنگلات اور سرور بخش دلکش باغات سے پر روحانیت کا ایک عظیم مرکز تھا۔ حقیقتاً بہشت خرم۔ غالب بنارس کی تعریف جس والہانہ انداز میں کرتا ہے، اس سے یہ بات واضح ہے کہ وہ واقعی یہاں روحانیت کے دریائے حسن میں غرق ہو گئے تھے۔ اُس 'دویہ آنند' یا روحانی مسرت کے سامنے اسے ساری دنیا ہیچ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان

جیسے لوگوں سے جن سے وہ ہمیشہ ہی ملتے رہے ہیں، مل کر اس 'آنندمے' اور پرمسرت وقت کو ضائع کردیں۔ غالب واقعی یہاں کسی سے ملنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ یہاں کی روحانیت سے فیضیاب ہونا چاہتے تھے۔ اور یہ فیض اسے حاصل بھی ہوا۔

رضا حیدر

غالب، بنارس اور ہماری مشترکہ تہذیب

شاعری چاہے کسی زبان میں کی جائے اس میں تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے ہمیشہ کام لیا جاتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری شیخ و برہمن کعبہ وکلیسا، بادوساغر، دشت و صحرا کے تذکروں سے بھری پڑی ہے اور شاعروں نے انہیں سے اپنی بزم فکر سجائی ہے۔ اور انہیں کو نئے نئے رنگ دے کر اپنے تجربات کی دنیا آباد کی ہے۔ مرزا غالب کی معنی آفرینی بھی بہت کچھ انہیں علامتوں اور تمثیلوں کی رہینِ منت ہے۔ غالب کی اردو شاعری میں دیر وحرم، کعبہ و بت خانہ، کفر اور دین کی علامتیں بار بار آئی ہیں۔ غالب نے ہندومت، اسلام، درویشی عقائد اور صوفیانہ خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور ان میں بعض بنیادی مشترک پہلوؤں پر غور کیا تھا اور سوچ سمجھ کر اس مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر کو اپنایا تھا۔ جسے عام طور سے وحدت الوجود کہا جاتا ہے جس کی روشنی میں حقیقت ایک ہوتی ہے اور اس کے مظاہر سینکڑوں خیالوں کا ظاہری فرق دیر وکعبہ وکلیسا اور بت خانے میں دیواریں کھڑی کرتا ہے۔ اصل ایک ہی ہوتی ہے۔ غالب کی فکر میں ہندوستانی قوم بسی ہوئی تھی۔ جو

مشترکہ کلچر کا مثالی نمونہ تھی۔ جس میں ہندو مسلمان کی وہ تفریق نہ تھی جس نے دیکھتے دیکھتے سماجی لعنت کی صورت اختیار کرلی۔ غالب کے زمانے میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ میل جول اور باہمی اتحاد رکھتے تھے۔ منفارت تو درکنار ایک دوسرے کے ساتھ بڑے خلوص و محبت اور یگانگت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ غالب کے دوستوں کی تعداد کافی تھی جن میں اُن کے ہندو شاگرد اچھے خاصے تھے جو اپنے اردو فارسی کلام پر ان سے اصلاح لیتے تھے۔ غالب اپنے خطوط میں جہاں مسلمانوں سے مخاطب ہیں وہیں ہندوؤں کو بھی والہانہ پیار و محبت سے مخاطب کرتے ہیں۔ ہرگوپال کو پیار میں انہوں نے میرزا کا لقب اور تفتہ کا تخلص دیا۔ ایک خط میں میرزا تفتہ کو ہر مہینے کم از کم ایک خط صرف اپنی خیریت کا بھیجنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ اگر میرا سگا بھائی زندہ ہوتا اور تمہاری برائی کرتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔ اسی طرح منشی شیونرائن کو لختِ جگر، فرزند دلبند، برخوردار اور نورِ چشم کے پیار بھرے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ منشی شیونرائن کے والد منشی بنسی دھر اور غالب ہم سن تھے۔ دونوں ایک محلے میں رہتے تھے۔ ایک جگہ اٹھتے بیٹھتے اور کھیلتے کودتے تھے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتے اور کوٹھے پر پتنگ اڑاتے تھے۔ منشی شیونرائن کے خاندان اور غالب کے گھرانے کے پرانے مراسم تھے۔ منشی شیونرائن کے پرداد اور غالب کے نانا گہرے دوست تھے۔ غالب کے نانا نے جب اپنے کسی گاؤں کا مقدمہ لڑا تو پیروی منشی شیونرائن کے دادا نے کی۔ غالب نے اپنے ایک خط میں شیونرائن کو مخاطب کرکے لکھا ہے کہ:

> میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ
> تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ
> میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم
> لکھوں تو گنہگار۔ تم کو ہمارے خاندان اپنے
> خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم۔ مجھ سے
> سنو تمہارے دادا عہدِ نجف خاں میں میرے
> نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے

رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک
کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر
کھول دی۔ اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ
باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔

یوں بھی مرزا غالب کے تعلقات ہندوؤں سے اچھے خاصے تھے۔ جواہر سنگھ جوہر تو شاگردِ رشید تھے۔ ہیرا سنگھ معتقد و حاشیہ نشین تھے۔ منشی نول کشور سے بھی کافی تعلقات تھے۔ انہوں نے غالب کا کلیاتِ فارسی چھاپا۔ قاطع برہان کے مشہور مقدمے میں دیبی پرشاد نے غالب کے وکالت نامہ پر بطور گواہ دستخط کیے اور عدالت میں چار گواہوں میں سے دو گواہ ماسٹر پیارے لال آشوب اور حکم چند ولد رام دیال ہندو تھے۔ لیکن شاید ہی غالب کو کوئی شاگرد اتنا عزیز ہو جتنا تفتہ تھے۔ غالب اپنے ایک دست کو لکھتے ہیں۔ ''واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزندوں کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو خدا نے ایسا قابل فرزند عطا کیا''۔ مرزا تفتہ کا قیام لوہارو اور آگرہ بھی رہا لیکن مسکن سکندر آباد تھا۔ جہاں وہ قانون گو تھے وہ دلّی بھی آنا چاہتے تھے لیکن غالب نے روک دیا۔ قانون سے ان کی اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی شاعری سے۔ غالب کی سحر طرازی پر ساری دنیا سر دھنتی تھی حالانکہ انہوں نے اس فن میں تفتہ کے صاحب کمال ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ''۔

حالانکہ غالب کا زمانہ سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے بدترین زمانہ تھا۔ سلطنت پر زوال آچکا تھا۔ نظم و نسق میں ابتری مچی ہوئی تھی۔ امراء کا خاتمہ ہو گیا تھا نہ فوج میں کارگزاری کی لیاقت اور مستعدی باقی رہی تھی نہ اس کے سپہ سالاروں میں پشتینی بہادری اور وفاداری، چاروں طرف بدامنی کے آثار تھے۔ ہمارا سیاسی زوال انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ امراء اور عوام سب کی حالت بگڑ چکی تھی مگر ہماری تمدنی اور تہذیبی زندگی کو ضرر نہیں پہنچا تھا۔ اتحاد پسندی کے رجحانات جو اکبر کے زمانے میں وسیع پیمانے پر شروع ہوئے تھے وہ دارا شکوہ اور جہاں آرا بیگم کے زیر اثر اور قوی اور توانا ہو گئے اور یہ اتحاد و امتزاج غالب کے زمانے میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ غالب سے پہلے کے دو بزرگ مرزا مظہر جانِ

جاناں اور حضرت شاہ عبدالعزیز ویدوں کو الہامی سمجھتے تھے اور توحید پسند ہندوؤں کو اہلِ کتاب میں شمار کرتے تھے۔ بتوں کو بھی وہ خدا پر توجہ دینے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے اور کرشن کو اولیاء اللہ میں شامل کرتے تھے؛ مرزا غالب کے خیالات کے دائرہ کی وسعت اپنے اِنہیں پیش رو بزرگوں کی رہینِ منّت ہے۔ غالب تمام مذاہب کی خبریں رکھتے تھے اور وہ مذاہبِ عالم کے بارے میں سوچا کرتے تھے وہ زمین سے نکلنے والے لالہ وگل کی ماہیت پر بھی غور کرتے تھے اور آسمان میں بچھے ہوئے تاروں کے جال کا راز بھی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ اس سے بڑھ کر یہ جاننا چاہتے تھے کہ ان کے اندرونی روابط کیا ہیں۔ اسی سے وہ فکری عنصر پیدا ہوتا ہے جو انسان اور کائنات کی غرض وغایت کو سمجھنے پر اکساتا ہے اور مذہب کی حقیقت جاننے کا شوق پیدا کرتا ہے۔ غالب کی دیر و کعبہ کلیسا اور صنم کدہ شیخ و برہمن سے دلچسپی اسی ذوقِ جستجو کا نتیجہ ہے۔ شاعر اور فنکار کی حیثیت سے غالب کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز مختلف ہے۔ اور وہ اسی سوچ میں مبتلا رہتے تھے کہ یہ دنیا کیا ہے۔ کہاں سے آئی ہے اس کے راز کیا ہیں اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے یہ دنیا مختلف مذاہب میں کیوں بٹی ہے جب سب کا خدا ایک ہے تو یہ الگ الگ مذہب کیوں اور اگر لوگ مذہبی اعتبار سے بٹ بھی گئے ہیں تو ان میں فرق کیا ہے، کیا یہ سب ایک ہی قسم کی روحانی آسودگی کی تلاش میں نہیں ہیں۔ اگر سب ایک ہیں تو پھر آپس میں منافرت اور دوری کی وجہ کیا ہے۔ یہی وہ سوالات تھے جو زندگی بھر غالب کے اردگرد گھومتے نظر آئے اور غالب نے ان سوالات کا حل اپنی شاعری میں اور اپنی نثر میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اور یہی وہ سوالات ہیں جنہوں نے آج تک وید، قرآن اور انجیل کے ماننے والوں کو الجھا رکھا ہے اور اُن فلسفیوں کو بھی جو زندگی کے مظاہر کا راز تلاش کرنے کی تگ ودو میں لگے ہیں۔ غالب نے اپنی نثر و نظم میں کبھی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں اور کبھی صاف الفاظ میں کبھی محض ایک تشکیک آمیز سوال کی شکل میں اور کبھی پیغمبرانہ لب و لہجہ میں ان سوالات کو چھُوا ہے۔ ان کی اردو شاعری میں دیر و حرم کعبہ و بت خانہ، کفر اور دین کی علامتیں بار بار آتی ہیں اور ان علامتوں کا ذکر غالب نے اس لیے نہیں کیا کہ وہ کسی مذہب کو چھوٹا یا بڑا بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ان علامتوں کے ذریعے انسانی حقیقت کو سمجھنا چاہتے تھے۔

غالب مذہب کے معاملے میں آزاد خیال تھے وہ بڑے لطیف انداز میں مذاہب کے ظاہری رسوم پر طنز کرتے تھے لیکن جہاں تک مذاہب کے احترام کا سوال ہے وہ اس سے غافل نہیں تھے وہ مومن اور کافر، مندر کے پجاری اور حرم کے پاسبان برہمن اور شیخ میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے اور انہیں کو علامتوں میں استعمال کر کے غالب نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو مذاہب کے درمیان رواداری جذباتی ہم آہنگی کا منشور بن سکتا ہے۔ اُن کا مشہور شعر ہے:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اگر کسی شخص نے سچائی اور ایمانداری سے ایک مذہب اختیار کیا اور دوسرے نے کوئی دوسرا تو اس میں جھگڑے کی بات کہاں ہے۔ دونوں سچے ہیں اور دونوں کو ایک ہی برتاؤ کا مستحق قرار دینا چاہیے۔ مسجد اور مندر قبرستان اور شمشان کے لیے لڑ کر جان دینے والے اگر مذہب کے فرق کو اس نظر سے دیکھیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ مذہبوں کے ظاہری فرق کی تہہ میں جو اکیلی سچائی ہے اس کی طرف غالب نے اس طرح اشارہ کیا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اور آخر میں غالب کی مشہور مثنوی چراغِ دیر کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں یہ وہ مثنوی ہے جو ہماری مشترکہ اور گنگا جمنی تہذیب کی ایک اہم مثال ہے یہ مثنوی غالب نے بنارس میں تخلیق کی جو اُن کی بہترین فارسی مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ غالب نے مثنوی کا عنوان 'چراغِ دیر' یعنی مندر کا دِیا ہی نہیں رکھا بلکہ مثنوی کے اشعار کی تعداد ۱۰۸ تک محدود رکھی کیونکہ ۱۰۸ کا عدد ہندوؤں کے نزدیک بڑا مبارک عدد ہے۔ غالب شہر بنارس کی مذہبی اہمیت کو جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ یہ ہندوؤں کا سب سے بڑا تیرتھ استھان ہے اسی لیے انہوں نے بنارس کے لیے کہا ہے:

عبادت خانۂ ناقوسیاں است
ہمانا کعبۂ ہندوستاں است

مثنوی چراغِ دیر (اسداللہ خاں غالب)

منظوم ترجمہ از فارسی: حنیف نقوی

خموشی آج دمسازِ فغاں ہے
نفس پر صورِ محشر کا گماں ہے
شرر ساماں رگِ خارا صفت ہوں
غُبار آسا خرابِ شش جہت ہوں
دلِ بیتاب ہے شکووں سے پُر جوش
حبابِ بے نوا ہے یم بہ آغوش
زباں پر روح فرسا اک بیاں ہے
نفس خوں ہے، جگر آتش بجاں ہے
حکایت ہے یہ برہم مثلِ گیسو
مرے دعوے پہ شاہد ہر بُنِ مو
گلہ ہے دوستوں کی بے رُخی سے
کتاں سینہ سپر ہے چاندنی سے
نوائے ساز نے پھونکا ہے مجھ کو
مری آواز نے پھونکا ہے مجھ کو
نفس اک رشتۂ سازِ فغاں ہے
تپاں مانندِ نے ہر استخواں ہے

وہ گوہر ہوں جو دریا سے جدا ہے

وہ جوہر جس کو آہن نے تجا ہے

چمن دلّی کا جب قسمت سے چھوٹا

تغافل کیشیِ یاراں نے لوٹا

نہیں کوئی وہاں غم خوار میرا

وطن میرا ، نہ اب گھر بار میرا

مگر ہیں تین شخص ایسے وطن میں

کہ جن سے رنگ و رونق ہے چمن میں

وہ فضلِ حق نشانِ فضلِ داور

بجا ہے ناز جس کی دوستی پر

حسام الدین حیدر خاں وہ خوش خو

جسے ایماں کا لکھیے حرزِ بازو

امین الدین احمد خاں وہ دل بند

قبائے جاں کا کہیے جس کو پیوند

ہوا ہوں گھر سے میں ہر چند بے گھر

بھلایا مجھ کو ان لوگوں نے کیوں کر

چمن کے چھوٹنے کا رنج کم ہے

مجھے بے مہریِ یاراں کا غم ہے

اگر چھوٹا جہان · آباد، غم کیا؟

جہاں آباد ، گنجایش ہے کم کیا؟

چمن میں بہرِ تعمیرِ نشیمن

بہت ہے ایک شاخِ گل کا دامن

میسّر ہو اگر اتنا سہارا

وطن سے کیجیے یکسر کنارا

نظر میں آج اک ایسا چمن ہے

جو رنگ و نورونکہت کا وطن ہے

متاعِ فخر و سامانِ سعادت

جہاں آباد کو اس کی زیارت

وہاں تک جب سے پائی ہے رسائی

نگہہ کو دعویِ گلشن ادائی

یہ اس کے وصف کا فیضِ نمو ہے

زباں جنت طرازِ گفتگو ہے

بنارس نام اُس کا، چشمِ بد دور

بہشتِ خرم و فردوسِ معمور

کسی نے چین اس کو کہہ دیا تھا

تبھی سے چینِ پیشانی ہے گنگا

مناظر اس کے ہیں اتنے دل افروز

سلام آتے ہیں دلّی کے شب و روز

دکھاتے ہیں جو یہ نقشہ اسے خواب

دہن دلّی کا نہروں سے ہے پُر آب

حسد کہنا اسے سوئے ادب ہے

مگر یہ رشک ہو تو کیا عجب ہے

تناسخ پر ہے جن لوگوں کا ایماں

وہ ہیں یوں ارضِ کاشی کے ثنا خواں

نکلتی ہے یہاں جب روح تن سے

تو پاتی ہے نجات آواگون سے

بہار آتی ہے نخلِ . آرزو پر

حیاتِ جاوداں ملتی ہے مر کر

نہیں اس کی مسیحائی سے کچھ دور

کہ داغِ جسم ہوں جانوں سے کافور

رواں افزائی سے آب و ہوا کی

سراپا جاں بنے ہر جسمِ خاکی

ادا ناآشنائے جلوۂ ناز

پریزادوں کے دیکھیں اس کے انداز

مجسم روح ، بیگانہ جسد سے

پرے آلائشِ ہستی کی حد سے

مثالِ بوے گل یکسر لطافت

ہیولیٰ ماورائے جسم و صورت

یہاں کے خاروخس رشکِ گلستاں

یہاں کا ذرّہ ذرّہ جوہرِ جاں

بہاریں اس گلستاں میں ازل سے

مبرّا ہیں تلوّن کے عمل سے

بہاریں تُندیِ موسم سے بچ کر

چھپاتی ہیں اسی کے سائے میں سر

مئی ہو یا جولائی یا دسمبر

بہر موسم یہاں جنّت کا منظر

ادا کرتی ہے حق مشاطگی کا

لگاتی ہے خزاں صندل کا ٹیکہ

چڑھاتی ہیں عقیدت کے یہاں ہار

بہاریں موجِ گل کے باندھے زنّار

فلک ہے مدعی طاعت کے حق کا

لگاکر قشقۂ رنگیں شفق کا

خزاں کا تنگ جب ہوتا ہے گھیرا

بہاروں کا یہیں جمتا ہے ڈیرا

حریمِ بت پرستاں ہے یہ خطّہ
زیارت گاہِ مستاں ہے یہ خطّہ
عبادت خانۂ ناقوسیاں ہے
یہ گویا کعبۂ ہندوستاں ہے
صنم اس کے مجسّم شعلۂ طور
سراپا نورِ یزداں چشمِ بددور
بدن نازک مگر دل ہیں توانا
بحسنِ سادگی مطلب کے دانا
تبسم کا لبِ رنگیں پہ غازہ
دہن مانندِ گل شاداب و تازہ
ادائیں صد گلستاں جلوہ در بر
خرامِ ناز سے برپا ہو محشر
کرم میں موجِ گوہر کی روانی
ستم میں خونِ عاشق کی جوانی
وہ موزوں قد وہ عالم نقشِ پا کا
سماں وہ زیرِ گل بُن دام کا سا
فروغِ حسن سے غارت گرِ ہوش
بہارِ بستر و نو روزِ آغوش
جمالِ آتشیں سے انجمن سوز

بُتانِ بت پرست و برہمن سوز
بصد سامانِ آرائش چمن رنگ
چراغاں پرتوِ رُخ سے لبِ گنگ
کرم بخشی ادائے شست و شو کی
سند موجوں کے حق میں آبرو کی
سبھی گیسودراز و حشرقامت
دلوں کا کام کرنے میں قیامت
بدن گویا نشاطِ دل کا ساماں
سراپا انبساطِ دل کا ساماں
شرارت یہ کہ موجیں منہ چھپالیں
کرامت یہ کہ جاں پانی میں ڈالیں
دلِ دریا میں ایک شورش ہے برپا
کہ ہر مچھلی دلِ مضطر ہے گویا
لبِ گنگا پہ ہے اک عرضِ خاموش
چلی آتی ہیں موجیں کھولے آغوش
غضب جلووں کی ہے شعلہ فشانی
گُہر بھی ہیں صدف میں پانی پانی
بنارس شاہدِ رنگیں قبا ہے
یہ گنگا اس کا گویا آئنہ ہے

فلک نے رکھ کے حُسن اس کا نظر میں
جڑا ہے آئنہ سورج کا زر میں
خدا رکھے یہ شانِ حسنِ کامل
نہیں جز آئنہ جس کا مقابل
یہ جلوہ گاہے حسنِ لا اُبالی
جہاں میں ہے مثالِ بے مثالی
خوشا گنگا میں یہ پرتو فشانی
بنارس خود بنا ہے اپنا ثانی
دراصل اس رونمائی کے بہانے
اُتاری ہے نظر دستِ قضا نے
کہ ہے ارژنگِ چیں میں سحر ایسا
نہ ہے دنیا میں کوئی شہر ایسا
گلستاں اُس کے ہر دشت و دَمن میں
بہاریں خیمہ زن اُس کے چمن میں
چمن اس کے بیاباں در بیاباں
بہار اس کی گلستاں در گلستاں
یہ پوچھا میں نے اک روشن بیاں سے
فلک کی گردشوں کے رازداں سے
کہ ہے نایاب جنسِ مہروالفت

جہاں سے اُٹھ گئی ہے خیروبرکت

دلوں سے نقشِ ایماں مٹ گیا ہے

ہر انساں بندۂ حرص و ہوا ہے

جگر تشنہ پدر خونِ پسر کے

پسر ہیں دشمنِ جانی پدر کے

ستیز آمادہ ہے بھائی سے بھائی

اڑا جاتا ہے رنگِ آشنائی

نمایاں ہے جب ایسی ہر علامت

بپا پھر کیوں نہیں ہوتی قیامت؟

نمودِ حشر میں تاخیر کیوں ہے؟

یہ فتنہ بستۂ زنجیر کیوں ہے؟

تو کاشی کی طرف نظریں اُٹھاکر

جواب اُس نے دیا یہ مسکراکر

نہیں یہ صانعِ قدرت کی مرضی

کہ ہو برباد یہ فردوسِ ارضی

بلند اتنا ہے کاشی کا تجمل

نہ پہنچے اوج کو اس کے تخیل

سنبھل اے غالبؔ مجبور و لاچار

کہ ناخوش تجھ سے ہیں سب یار و اغیار

برت کر اقربا سے بے نیازی
جنوں کی کر رہا ہے دل نوازی
نمودِ حشر تیرے آب و گِل سے
دریغ ایسے بشر سے ، ایسے دل سے
گزر ان جلوہ ہائے رہگزر سے
بہشت اپنی بنا خونِ جگر سے
جنوں تیرا اگر ہوجائے کامل
تو ہے کاشی سے کاشاں نصف منزل
نکل مانندِ نکہت پیرہن سے
رِہا ہو اس طلسمِ جان و تن سے
طریقِ معرفت پہ گامزن ہو
نہ رہ پابند، آوارہ وطن ہو
توقف ہے دلیلِ نارسائی
قیامت ہے یہ کافرماجرائی
توجہ ان مسائل سے ہٹاکر
نظر کر محضرِ ذوقِ طلب پر
کر اب کاشی میں کاشانے کی باتیں
چمن میں چھیڑ ویرانے کی باتیں
جہاں کچھ خستہ دل، بے یار و یاور

سر شکِ خونِ حسرت کے شناور
ہوا و حرص سے دامن بچائے
تری چشمِ کرم سے لو لگائے
گھروں میں رہ کے بھی صحرا نشیں ہیں
بساطِ سوزِ غم پر جاگزیں ہیں
نظر آتے ہیں یہ بندے خدا کے
بنے سیماب آتش زیرِ پا کے
ترے ہاتھوں سے غلطاں خاک و خوں میں
پڑے تنہائی کی قیدِ زبوں میں
دلوں کو شمع ساں گلخن بنائے
لبوں پر ضبط کے پہرے بٹھائے
تری بیداد سے بے برگ و ساماں
تغافل سے ترے در پردہ نالاں
نہیں یہ سرد مہری تجھ کو زیبا
کہ سیرِ گل میں دھیان آئے نہ ان کا
نہ ہو اندیشۂ منزل سے غافل
مراحل سخت ہیں اور راہ مشکل
بڑھ آگے بن کے سیلِ تند رفتار
بیاباں راہ میں آئیں کہ کہسار

سبق لے قیس کے دیوانہ پن سے

گزر صحراؤں سے ، دشت و دمن سے

تن آسانی کو تاراجِ بلا کر

مداوا رنج کا کر رنج اُٹھا کر

فنا کی نذر کر حرص و ہوس کو

ہوا دے آتشِ دل سے نفس کو

جگر کو کاہشِ محنت سے خوں کر

خرد کو کار آگاہِ جنوں کر

حرارت باقی ہے جب تک لہو میں

کمی آئے نہ ذوقِ جستجو میں

شرر بن کر فضاؤں میں بکھر جا

تعین کے مراحل سے گزر جا

لگا کر ضربِ ''اِلّا'' سازِ ''لا'' پر

دم ''اللہ'' سے حرقِ ماسوا کر

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں